انتخابات زبان اردو

الموسوم بہ

تزک اردو

[illegible]

مولوی محمد اسمٰعیل

سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ

مجوزہ

جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم

صوبجات متحدۂ آگرہ واودھ

برائے درس جماعتہائے اپر مڈل یعنی ہفتم وہشتم انگلو ورنیکولر اسکولز

باہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

نول کشور پریس

حضرت گنج لکھنؤ

سنہ ۱۹۳۲ء

TO

THOMAS ROWLAND WYER, Esq., B.A., J.P.,

Officiating Commissioner, Rohilkhand Division,

FORMERLY MAGISTRATE & COLLECTOR, MEERUT,

who has given an impetus to HIGHER EDUCATION in the Meerut Division by founding a College at its Head-quarters

AND

Who has Organized, Expanded and Improved

THE MIDDLE & PRIMARY EDUCATION

IN

SOME OF THE DISTRICTS OF THE DIVISION.

THIS BOOK IS INSCRIBED

As a mark of Admiration for his Indefatigable Labours and Vast Sympathy for the Natives.

BY

THE COMPILER.

Lucknow:

PRINTED BY K. D. SETH AT THE NEWUL KISHORE PRESS.

1924.

دیباچہ

زبان اُردو کی کم مائگی مُسلّم ہی سہی۔ تو بھی یہ عذر انتخاب کی ذمّہ داریوں سے ہم کو چنداں سبکدوش نہیں کرتا۔ جو سبق طلبہ کے درس و مطالعہ کے لئے پیش کیے جائیں وہ بالضرور فصاحت و بلاغت میں کامل عیار۔ ادب و اخلاق کی میزان میں سنجیدہ دلآویزی و شگفتگی کے آب و نمک سے بامزہ ہونے چاہئیں ؎

کامیابی کا دعویٰ تو نہیں مگر ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مضامین منتخبہ میں حُسنِ ظاہر کے ساتھ معنوی پاکیزگی بھی ضرور ہو۔ زباندانی بیشک ایک جوہر ہے مگر جس زبان سے قوائے روحانی مضمحل ہو جائیں اُس سے تو بے زبانی ہی بمراتب بہتر ہے۔

نثر اُردو نے نظم سے بہت پیچھے رواج پایا ہے۔ اُس کی ابتدا قصّہ کہانیوں سے ہوئی اور تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ کہ تصنّع اور تکلّف نے اُس کو بیکار محض کر دیا۔ مگر مرزا غالب مرحوم کی تحریرات سادہ و سرسری نے اُس کا قدرتی حُسن دکھایا پھر سرسیّد مرحوم اور اُن کے مقلدین نے مغربی خیالات کی جان ڈال کر اُس میں مہذّب زبانوں کی سی آن و ادا پیدا کر دی۔ اگرچہ قابلِ انتخاب قریب تر زمانہ کی نثر ہے۔ مگر ہم نے مشاہیر قدیم و جدید سب کے کلام کا نمونہ لیا ہے۔ تاکہ طلبہ کو مختلف اسالیبِ بیان سے واقفیت حاصل ہو۔

اصنافِ نظم میں تو ہمارے شعرائے سخن سنج نے شیوا بیانی اور آتش زبانی کی دھوم مدّت سے مچا رکھی ہے اور ریختہ کو رشکِ پارسی بنانے میں کسر نہیں چھوڑی لیکن اِس سیمیائی باغ میں سے ایسے گُل پھول چُننا جو نوخیز طبائع کو آشفتہ اور جذباتِ نفسانی کے بھوت کو بیدار نہ کر دیں۔ سخت مشکل کام ہے۔ بایں ہم نے اِس طلسم کدہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھّا اور اساتذۂ ماضی و حال کے پاکیزہ کلام کے اِس مجموعہ کو زیب و زینت دی۔ اُمیّد ہے کہ اِس انتخاب کے مطالعہ سے مہارت زباندانی کے علاوہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُردو کی نظم و نثر نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں کیا کیا منزلیں اپنی ترقّی کی طے کی ہیں۔ مارچ ۱۸۹۹ء

محمد اسمٰعیل

فہرست مضامین تو زک اُردو
حصۂ نثر

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ نثر

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں۔ کے سی ایس آئی۔ ایل ایل ڈی

ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء سر سید نے علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی۔ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق دونوں اُن کی اڈیٹری میں نکلتے تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تفسیر القرآن ہے۔ چھ جلدوں میں انکا طرز تحریر سادگی و روانی و دلنشینی میں مشہور ہے۔ تکلف نام کو نہ تھا مشکل سے مشکل مضمون کو اس خوبی سے بیان کرتے کہ گویا پانی کرکے بہا دیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو زبان کے علم ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا اثر تو اُس پر پڑا وہ زیادہ تر سر سید ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اُن کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

سویلزیشن یا تہذیب (از تہذیب الاخلاق)

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں۔ کہ سویلزیشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اسکے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جسے لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے۔ کہ اُس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اُس کا تعلق ہے۔ وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے اس امر کے تصفیہ کے لیے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں

شہریوں میں سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں اِلّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُس کی طبیعت اس طرف مائل ہے۔ کہ اُس بُری چیز کی حالت کو۔ ایسی حالت سے تبدیل کرلے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے اسی تبادلہ کا نام سِولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ میلان یا یہ خواہشِ مُبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سِولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سِولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خَلقی اور خُلقی۔ مُلکی اور تمدُّنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہراتے ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ قوموں کی سِولزیشن میں اختلاف پڑجاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سِولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔*

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہوکر بستا ہے۔ تو اکثر اُنکی

ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔ اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں۔ سب یکساں ہوتی ہیں۔ اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کرسکے ؂

ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے۔ جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے اور جس کے باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کرسکتے ہیں۔ جنکے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات اور علم طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجیب ہے ؟

کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو۔ کہ اِس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دُنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادی یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسایش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُس کو ترقی دینا تمام دُنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر وجواہر یاقوت والماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرایش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرایش میں۔ سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھیلے ہوے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ بھی اُس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونسلے درختوں پر باندھے ہوے ٹانڈ بھی

میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزوں تمدّن کے قاعدے عیش وعشرت کی مجلسیں۔ خاطر ومدارات کے کام اخلاق ومحبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عُمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے اُن کی ادا اور آواز کی پھِرت۔ اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اُپج۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال اور راگ راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر اُن کی لَے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا۔ دل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن ضیاگری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عُمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے

پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادّی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنے سے اعلے درجہ کی طرف تحریک ہوسکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے ؛

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے ؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات معاشرت۔ طریق تمدّن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اسکا نتیجہ کیا ہے ؟ روحانی خوشی۔ جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین۔ حقیقی وقار۔ اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانپن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

(سید احمد خاں)

عزت

(از تہذیب الاخلاق)

بہت کم لوگ ہیں۔ جو اُس کی حقیقت جانتے ہوں۔ اور بہت کم ہیں جو اُس کے مشتقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں جس کی لوگ بہت آؤبھگت کرتے ہیں۔ اُسی کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ معزز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہو اُس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے یہی حال انسان کا ہے:۔ جب تک اُس کی حالت بھی عزت کے قابل نہو۔ وہ معزز نہیں ہوسکتا۔

لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل بلکہ قریب ناممکن کے ہے۔ پس اُن کا کسی کو معزز سمجھنا درحقیقت اُس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا اور معزز سمجھتا ہو جس کو انگریزی میں سیلف ریسپیکٹ کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بنا کر کہتا ہے۔ تو خود اُس کا دل اُس کو ٹوکتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے گو سُننے والا اُس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزتوں میں کا ایک بے عزت ہے۔

اسی طرح تمام افعال انسان کے۔ جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیے جاتے ہیں۔ گو لوگ اُن کی عزت کرتے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ

عزّت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزّت کے لائق وہی کام ہیں۔ جن کو دل بھی قابلِ عزّت سمجھے۔ اِس لئے انسان کو انسان بننے کے لئے ضرور ہے کہ تمام اُس کے کام سچّائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں۔ جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کی عزّت ہمارا دل نہ کرتا ہو کسی سے ہم اظہارِ دوستی اور محبّت کا نہ کریں اگر درحقیقت ہمارے دل میں اُس سے ویسی ہی محبّت اور دوستی نہ ہو۔ جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دِل اچھا نہ سمجھتا ہو۔

"صلحِ کل ہونا" اگر اِس کے معنی یہ ہوں۔ کہ سب سے اِس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ تو یہ تو نفاقِ اکبر ہے ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کا دوست ہوتا ہے اور اگر اِس کے یہ معنی ہوں۔ کہ کسی سے بغض۔ عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے۔ کسی کا بُرا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی بُرائی نہ چاہے وہ بلا شُبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے اُس میں دو چیزیں یعنی عداوت (کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو) اور محبّت سما نہیں سکتی۔ وہ ایسی کُلھیا نہیں ہے۔ جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبّت کا۔ ایک عداوت کا۔ اور اس لئے یہ دو چیزیں گو اشخاص متعدد اور حیثیاتِ مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں دل میں سما نہیں سکتیں۔ اس لئے انسان کو لازم ہے کہ محبّت کے سوا کسی دوسری چیز کے لانے کا دل میں خیال ہی نہ کرے۔ اور ایسی ہی زندگی انسان کے لئے عمدہ زندگی ہے۔

(سیّد احمد خان)

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ

(از تہذیب الاخلاق)

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ

ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہونچایا۔ اور اُس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصوّر قدرت نے کھینچ رکھی ہے۔ دکھایا۔ درحقیقت میں نے اُسے ویسا ہی پایا جیسا سُنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اُس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہونچا۔ تو ایک چاردیواری دیکھی۔ جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمت سے بھی زیادہ مضبوط تھی قدرت نے ایسا سُنہرا رنگ دیا تھا کہ جب سورج کی کرن اُس پر پڑتی۔ تو وہ دیوار زرنگار کندن کی طرح چمکتی جس سے آنکھوں کو چکاچوند ہوجاتی اُس دیوار کے چاروں طرف پھرا۔ پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے۔ اور ایک بلندی پر چشمہ دیکھا۔ جس سے نہر میں پانی گرتا ہے۔

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرد تھا اُس سے حقیقت اُس کی پوچھی تو اُس نے کہا کہ " اِس کے اندر ایک ایسا پرفضا

باغ ہے۔ جیسے جنّت عدن بھی دیکھیے۔ تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے شاداب کرنے کے لیے بنائی گئی ہے"۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا۔ اپنے رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا۔ اور میں نے اُس کی کامل اطاعت اور بڑی تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا۔ میں اُس دروازہ کی محراب کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیا بیان کروں۔ میں جاتے ہی سب تانا نہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سیر سے سیر ہونا چاہا۔ میری اس بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا۔ کہ "اے نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر کیا آسان ہے جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد ابد ہے"۔

خیر میں نے ہوس کو روکا۔ اور خرد نے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس کے بعد چند کیاریاں اس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر اُن کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اُس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا۔ قمری کی آواز۔ بلبلوں کا پھولوں پر گرنا۔ پھولوں کا کھلنا۔ کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظربازی اور شمشاد کی سروقدی نے مجھے ایسا مست کر دیا کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔

میں چند سے اس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا اور اُس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور باہر نکلا۔ کہ کوئی مجھ سا ملے۔ تو یہاں لاؤں اور اپنا

دل خوش کروں +

میں اس باغ سے نکل کر برسوں اسی تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ ملا آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی۔ نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھلا ہوا دیوار شکستہ اور کچھ نئی قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا کہ یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب؟ کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے نہ دروازہ کی وہ رفعت و شان۔ چشمہ بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے؟ اُس نے کہا۔ کہ یہ وہ باغ نہیں ہے۔ دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا +

جب میں باغ کے اندر گیا۔ تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر نہ وہ صفائی۔ نہ وہ خوبی۔ نہریں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی کی وہ لطافت۔ نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے سب کُملائے ہوئے۔ میوے جس قدر تھے۔ وہ سوکھے پڑے ہوئے۔ سبزہ کے زمردیں رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی، گلوں کی سُرخی پر زردی آ گئی تھی۔ نسیم کے بدلے صرصر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا۔ نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ اپنی خشکی پر رو رہی تھی۔

میں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہونچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں! کہ چند خوبصورت ماہرو نوجوان آئے۔ اور اُس نہر میں پانی پینے اور غوطہ لگانے لگے۔ جب وہ نہا دھو کر اُس سے نکلے۔ تو اُن کے چہرے بدلے ہوئے نظر آئے۔ نہ وہ شکل و شمائل تھی۔ نہ وہ نزاکت و نرمی اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے کہ کسی کا سینگ ٹوٹا کسی کا چہرہ بگڑا۔ کسی کا غصّہ سے چہرہ لال ہوا کسی کا کف منھ سے اُڑکر مجھ تک پہونچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصّہ کے تن گئیں کسی کے منھ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی اسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالیشان مکان کی طرف چلے میں بھی ساتھ ساتھ ہو لیا۔ کہ دیکھوں۔ کیا ہوتا ہے؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا۔ دُم طاؤس کی منھ چڑیا کا پیٹ بیل کا۔ چال لومڑی کی ایک رنگین سمور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹر غوں کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان اُس کے پاس پہونچے تو اُس کے آگے گر پڑے۔ اُس نے ایک کریہہ ہولناک آواز سے اُن کو پکارا۔ اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ اُن لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں اُسے جواب دیا کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا کہ اس وحشی آدمی نے کچھ خوش ہو کر کسی کا منھ چوما۔ کسی کو پیار کیا۔ اور کسی کو "مرحبا" کہا +

میں اس معاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور راہ نما سے اس اسرار کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا کہ "اس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے۔ کہ سب ایسی شکل کے ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان۔ نازک۔ ماہر و لڑکے بھی جب زیادہ پانی پییں گے۔ خوب۔ غوطے نہر میں لگائیں گے تو ایسے ہی ہو جائیں گے اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ بلکہ اُن کا علمی مباحثہ تھا۔ جسکے لفظ بھی تمھاری سمجھ میں نہ آئے"۔

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا۔ تو رہنما مجھے چشمہ کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ چشمے کے دہانہ پر دو چشمے آکر ملے ہیں ایک تو سیدھا چلا گیا ہے۔ جو کہ نہایت صاف۔ پاک اور خوش گوار ہے۔ دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے جس میں جابجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں جو کہ سب کثیف میلی اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمے کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے۔ جس سے صاف پانی نہیں آسکتا۔ مگر دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اُسی کا میلا بدبودار زہریلا پانی گرتا ہے۔ اور وہی باغ میں جاتا ہے۔ جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے اُن چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامے رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ میں اُن دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدت بعد سب حال دریافت کر کے اس فکر میں پڑا۔ کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب تاریخ

نامے ایک روشن ضمیر مِلا۔ اُس نے کہا۔ کہ ہزار برس ہوتے ہیں۔ تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ۔ سبز و شاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو ہم نے اوّل دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گدلے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سر کتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آگیا ہے +

تب تو میں نے خیال کیا۔ اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لے کر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا میرے رہنما نے کہا۔ کہ اور بھی تیری طرح اس ارادہ پر آئے۔ مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں۔ جس کی روشنی سے یہ اندھے ہو کر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ **بصیرت** کی مشعل اُس نے مجھے دی درحقیقت جب میں وہاں مشعل لے کر پہونچا۔ تو کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ **ہمدردی** نامے واعظ میرے سامنے آیا اور کہا۔ کہ "مجھے اجازت دو۔ تو کچھ مدد کرنے والے لے آؤں"۔ میں نے خوش ہو کر اُسکا شکر کیا اور بڑے زور شور سے اُسے اپنی ہی صورت شکل والوں پاس بھیجا پر افسوس! کہ بہت کم لوگوں نے اُس کی بات سُنی جو لوگ اُس نہر کا پانی پی چکے تھے۔ وہ تو مارنے کو دوڑے۔ اور جو لوگ ابھی اُس سے بچے ہوئے تھے اُن کے کان بہرے تھے۔ انھوں نے کچھ نہ سُنی۔ آخر وہ باحسرت

وہاں واپس آیا۔ اُس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا۔ کہ اس خیال کو
چھوڑ دوں۔ اور یہ پتھر جیسا رکھا ہے ویسا ہی رہنے دوں پر استقلال
نام ایک رجز خوان نے میرا دل بڑھایا۔ اور مجھے ایک تدبیر بتائی
اُس نے کہا۔ میں نے ایمان نام فقیر سے سُنا ہے۔ کہ اس چشمہ کا ایک
کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے
انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اول تو
مصیبت کا ایک بڑا میدان لق ودق ملتا ہے۔ جہاں سوائے آنکھ کے
پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اُس سے بچ گئے تو رسوائی و بدنامی کے
سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی
ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اُس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی
پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہونچائی جاتی
ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ گو کبھی
ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی پس اگر
تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے۔ تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اُس
تک تمھاری رسائی ہوئی۔ اور اُس نے تمھاری نذر لے لی تو وہ اقبال
کو تمھارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے
سب کی آنکھیں کھُل جائیں گی۔ جو آپ بند ہو رہی ہیں تب وہ اپنے سوکھے
ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کرینگے اور تمھارے ساتھ پتھر سرکانے پر
مستعد ہوں گے۔ آخر چند ہی روز میں گدلے چشمہ کا پانی بند کر کے صاف

چشمے کے پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔ تب یہ سوکھا ہوا باغ اُس ہرے باغ سے بھی تمہاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوشنما معلوم ہوگا۔ کیونکہ نہ وہ باغ تمہارا باغ ہے۔ نہ وہاں کوئی تم سا ہے اور یہ باغ تمہارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں"۔ میں نے اُس رفیق کا شکر کیا اور اُس کے کہنے کے مطابق چلا۔ کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے ؟۔

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا۔ تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے میں صرف یہ کہ کر کہ جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا۔ وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا۔ وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سر چشمہ پر آگیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ تلے ہی تلے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی۔ بیکی تعصب۔ علم نالوانی جھوٹا زہد۔ جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقریر۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے چپ ہو رہا ✦

خواجہ الطاف حسین حالی

زبانِ گویا

اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیِ شیریں بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے۔ جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی اور کبھی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جسکے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں +

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا۔ اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بین کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق +

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزّت۔ ہماری ذِلّت۔ ہماری نیکنامی ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اِس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا ؎

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ۔ اِس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اِس قدرت کو خاک میں نہ مِلا۔ راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اِس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اِس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پہ حاشیے نہ چڑھا ؎

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اُس کا خزانچی۔ حوصلہ اُس کا قفل ہے۔ اور تو اُس کی کنجی دیکھ اِس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔ اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اِس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو

یہ اُمید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بولے۔ اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے مُنہ میں اور دوسرے کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے کسی نے اُنھیں۔ فریبی اور مکار کہا کسی نے گستاخ اور مُنہ پھٹ اُنکا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بد عہد بنایا۔ اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع گالی اور دُشنام۔ پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے ✦

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پر کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائینگے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے ✦

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتّا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ!

وہ نام کے جانور۔ اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پہ "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے۔ تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچے بنکر آئیں۔

(حالی)

حیاتِ سعدی

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلص ہے۔ سرگور اوسلی نے اُسکی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تختِ شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اِس لئے اِس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک باخدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اِس سے زیادہ معلوم

نہیں۔ کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اِسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوے کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا اِنتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علما اور مشائخ اور فصحا اور بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطۂ فارس میں اہل کمال ہو گذرے تھے۔ بزرگوں سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے۔ یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی رِیس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اسی لیے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا

سامان مہیا تھا۔ علماے جلیل القدر درس وتدریس میں مشغول تھے۔ مدرسۂ عضدیہ جوکہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا۔ اور اس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے۔ لیکن اُس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دل بامروّت اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اس کی طبیعت میں۔ اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑکر عراق کے حدود میں لشکرکشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کردیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف وجوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل وغارت کرکے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت وتاراج کیا۔ کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبتِ شیراز بہ کلی بگرفت   وقت آنست کہ پُرسی خبر از بغدادم
سعدیا حُبِ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح   نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ۔ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ مَیں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مَرا نہیں جاتا +

شیخ کے عام حالات

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا اُس کے قویٰ کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے۔ اور اپنی عمر کا بہت بڑا حِصّہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی +

اُس نے صِرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے۔ بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اِتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارہ سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کا کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مُدت تک سقّائی کی تھی +

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جابجا یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ وہ اِس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی۔ مگر آج کل

کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف۔ ایک نہایت بے تکلف کھلاڑ دلا
یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دُور۔ سید ھا سادہ مسلمان
تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت
سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مُقدّس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر
ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق
کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا اُس نے مثل ظہیر
رشید۔ خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور
امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ بایںہمہ
وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے
بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبّت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا۔
وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا
ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے
قصیدے ایسے ہیں۔ جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق
بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اِس لئے بھی
زیادہ تر میل جول رکھتا تھا۔ کہ اکثر اُس کی سفارش سے (جیسا کہ گلستان
کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے) غریب آدمیوں کے کام نکلجاتے تھے۔

خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی۔ کہ نہایت ضرورت اور احتیاج
کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے قحط
میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالےٰ

سے نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اِس قدر مقبول نہ ہوتے۔ اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیئے وقف کر دیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہوں ایک جوہر فطری دوسرے زمانے کے ایسے اتفاقات جو اُس کی جلا کے باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا۔ وہاں ہونہار بچوں کو تمدد تحصیل کی ترغیب ہونی چاہیئے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالت میں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں ٭

جس مدرسہ میں وہ حسنِ اتفاق سے تحصیل علم کے لیئے پہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سر برآوردہ تھا اور جس دارالخلافت[1] میں وہ مدرسہ واقع تھا۔ وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائیٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانہ نے بھی اُس

---

[1] بغداد ٭

کی تادیب خاطر خواہ کی تھی اُس کی عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دُور دراز سفر کرنے اور دُنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور مُلکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے۔ ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا۔ کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پہونچ گئے ؛

ساتویں صدی میں۔ جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے۔ عجیب و غریب تماشے اُس کی نظر سے گذر گئے سلاطین کُردیہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت۔ ایشیا۔ افریقہ و یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی۔ اِسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقۂ قونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا۔ اِسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریاے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی اِسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اِسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون

مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے۔ اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصّاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اِسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکانِ فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا۔ دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا۔ اِسی صدی میں کئی بار قتل اور غارت کیا گیا۔ فرقۂ اِسماعیلیہ جو پونے دوسو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا۔ ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کُردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اِسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحبِ بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصِل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے۔ اُس میں کہتا ہے "خدا حمایت کرے اُس شخص کی۔ جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مُصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے" یورپ کے مشہور مصنف ہگ ہلر صاحب کا قول ہے۔ کہ "میں نے عُمدہ تعلیم صِرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دلسوز اُستاد تھے"۔

(حالی)

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

(از رویائے صادقہ)

ریاضتِ جسمانی

ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سُود اور
بے سُود ہوں تو خیر، اُلٹے مُضر۔ بداخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض
میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی چوپر
شطرنج میں غور اور خوض کی عادت۔ تو اُن میں بڑی قباحت یہ ہے
کہ دُنیاوی معاملات میں اُن سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ
اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کو پتّوں کی یادداشت اچھی
ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا!
صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اِسی طرح بڑے سے
بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے۔ مگر ایک
سیدھا سا مُقدمہ اُس کے سامنے بیان کرو۔ تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر
سُوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب
نکمّے۔ موجب تضیع وقت۔ اب مدرسہ کے کھیلوں پر نظر کرو۔ تو نِری
جسمانی ریاضت۔ اور تفریحِ طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل
نہیں۔ کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے
بس دماغی محنت بہتیری ہو لی اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا

پڑے۔ تو دماغ کہاں تک اِس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ تو جس طرح گھوڑا تھان پر بندے بندے ہڈ کے مُوتر سے نکال لاتا۔ آدمی میں بھر جاتا۔ دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا تھوڑی دُور چلنے سے ہانپنے لگتا۔ کوس دو کوس دوڑانا چاہو۔ تو دوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا۔ تو اگر اور کوئی بیماری اُس کو نہ بھی ستائے۔ یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اِسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں۔ کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں ؛

خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ ہم ہندوستانی گُڑیں کیا مقابلے کریں گے۔ اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی شہر میں آنکلتے ہیں۔ تو اُن کو دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں! جنگلی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار باجرے کی رُوٹی کے سوا اور کچھ میسّر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ کہ ایک دیہاتی سَو سَوا سَو مَن کی چو بلدی گاڑی ہانکے لئے چلا جاتا تھا شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بد کے۔ کہ گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جاتا رہا بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کھسکا۔ گاڑیبان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی۔ نہ شہریوں کا ماءاللحم۔ نہ اُن کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے بیشک شہر اور دیہات کی آب و ہوا میں بھی بہت

بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹھا پن ہے محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب۔ اُس پر محنت مشقت ندارد۔ جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں۔ اور بوٹی ہو۔ تو کہاں سے ہو۔ بیچارے کو کبھی کھُل کر بھوک نہیں لگتی۔ اور مارے ہو کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے۔ تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں سینہ اُبھرا ہوا ہے۔ قبضے چڑھے ہیں۔ دیکھنے کو موٹے تازے۔ داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا اِن میں بھی نہیں +

اِس پر ایک حکایت یاد آئی ہے۔ کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گُذاری کے اور کوئی کام نہ تھا۔ نکمّے بیٹھے بیٹھے اِن کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے۔ کہ ستار بجا رہے ہیں یا بٹیر لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یا اِس کی دُھن ہے۔ کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے۔ کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہُت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں تیار کی تھیں۔ کہ جواڑوں میں جا جا کر کشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی کہ اِن دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں۔ کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے صاحب عالم اِس ایجاد کو سنکر پھڑک گئے۔ اور فرمایا بھئی واللہ تخت کی قسم ہے کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا ولائتی کی کشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے

داروغہ جی دینا اِن کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اِس کشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور مَیں حضور میں بھی عرض کروں گا سرفراز فرمائیں گے" ✤

نہیں معلوم۔ ظالموں نے کیا تدبیر کی کہ ایک اکھڑ وحشی ولائتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی آدمی کاہے کو تھا۔ ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں مَیلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بُو آتی تھی۔ ایسی سخت۔ کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جوتیوں سے۔ اُدھر مشکیزہ سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آئے خونخوار آنکھیں۔ ڈراونی صورت۔ لوگ جو اِس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے اُس کے گرداگرد ایسے معلوم ہوں۔ جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے۔ اور کوئی تین سوا تین مَن کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اِس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے۔ کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اُس پر بندھی ہے کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے۔ کوئی بنیٹی کے کرتب دکھا رہا ہے اتنے میں غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لا کر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا۔ اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ کہ موت کے منھ میں جائے۔ اور ولائتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گاؤ تکیہ

تماشائی نظر حیرت و تعجب سے سب کو تکیا دیکھ رہا ہے۔ اور ان پہلوانوں کو سمجھتا ہے کہ بتوں کا تماشا کر رہے تھے آ گیا ہے

اکھاڑے کا استاد اگرچہ تھا تو عمر سے اترا ہوا۔ مگر اس کا بدن ایسا مرتب تھا۔ اور اس کو اپنے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا ع

فربہی چیزیست کہ در گردن آں ساختہ ہر دیگر است

اس نے پہلے سے صاحب عالم کے پاس جا کر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا۔ اور استاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں لیکن سرکار راجہ جی کے چاقو کو قصائی کے گنڈے سے بھڑاتے ہیں ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا۔ حکم کی تعمیل میں مجال عذر نہیں پچھڑیں گے تو نہیں۔ مگر اس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجیے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمائی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے۔ تو بسم اللہ اس کا دبوچا ہوا آدمی بچھڑ کا بھی تو نہیں کھلانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت!" صاحب عالم سمجھے تو سہی۔ مگر سارے میں غل مچا چکے تھے کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے! +

بارے لوگوں نے ولائتی سے کہا۔ کہ آغا! ان لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمہارا جی چاہے کشتی لڑو۔ "آغا" ہم سب کے ساتھ لڑے گا"! +

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا۔ خیر ایک نئی دار دو۔ استاد

اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے سبھی نے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نہ جنبد۔ لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں*

ان لوگوں نے نادانی یہ کی۔ کہ آغا سے گتھ گئے۔ اُس نے موقع پاکر ایک کو تو اس بغل میں دابا۔ اور دوسرے کو دوسری بغل میں اُس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبایا تھا۔ مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کوب لیے پھرتا ہے۔ اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب سُنا اچھا تو ہو گیا ہے۔ مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا*

خیر بنی آدم میں یہ ولائتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں۔ اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اسکے عقلی دلائل موجود ہیں۔ کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں۔ اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں۔ تو آیندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھہرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لیے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو۔ تو جس قدر برداشت کیجا سکتی ہے وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہے اور پھر ہلدی لگے نہ پھٹکری*

(نذیر احمد)

عقل کی نارسائی

(از ابن الوقت)

بلاشبہ مبدا، فیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے اور وہی مدارِ تکلیف شرع بھی ہے لیکن ایں ہمہ بریں نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اُس سے باہر نہیں۔ پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو۔ مثلاً فرض کرو۔ کہ کشتی یا ریل میں ہو۔ تو وہ اُلٹا ٹھیری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھیرا ہوا۔ تیز حرکت متشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں تو جھکی ہوئی دکھائی دے گی شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے ٭

غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے۔ اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے وہ بھی نقصان سے بری نہیں۔ اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لیئے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے ہندسہ کے علاوہ جسکے اصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر فلسفی۔ جج۔ ایسٹرانومر[1] (ہیأت داں)

[1] انگریزی لفظ ہے۔ ز تلاوت جمع۔

پالٹیشنز (مدبّران مُلک) اہل مذاہب وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں منطق کے قاعدے منضبط ہوئے مناظرے کے اصول ٹھیرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تا قیامت کم ہو۔ جب ہست و نیست کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک بر سر غلط ہے ٭

اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے مگر ہم ذرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا تو اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈس کوریز۔ یعنے زمانۂ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجوداتِ نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دُھن لگا دی ہے۔ خُدا اُنکی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بحرِ بے پایانِ موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں اور معلومات جدید کے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں ان ماڈرن ڈس کوریز میں سے (زیادہ نہیں) صرف ایک چیز عام فہم ہے جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ریل اب ہم پوچھتے ہیں۔ کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں نہیں معلوم ہوئی۔ اور یہی سوال ہر

٭ پالی ٹی شین ۶ واحد۔ ز علامت جمع ۱۲ ٭ ڈس کوری = واحد۔ ز علامت جمع ۱۲

اُس کوری کی بابت ہو سکتا ہے جو اَب تک ہوئی یا آیندہ کسی وقت میں ہو
سر اسحٰق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا۔ کہتا
تھا کہ خُدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے
ہیں۔ اور مَیں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچّوں کی طرح سیپیاں اور
گھونگے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا اُس شخص کا۔ جس نے زمین اور
آسمان کے قُلّابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج
سارا یورپ اُس کے نام پر فخر کرتا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی ہے
وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے
زمانے کے انگریزی خوان ہیں کہ سیدھی سی اقلیدس کی نئی شکل پوچھو
تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ۔ کہ ہمچو ما دیگرے نیست
پس جُوں جُوں زمانہ ترقّی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا قُصور ہے
کہ کُھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس
پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی۔ کہ مہینوں کی مسافت ہم
گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں
معلوم کر لیا کریں گے۔ یا آگ سے برف جمائیں گے یا کپڑے کی کل میں
کپاس بھر کر اچھے خاصے ڈھلے ڈھلائے تہ کیے ہوئے تھان نکال لیا
کرینگے۔ اور ابھی کیا معلوم۔ کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہینگے
آدمی۔ عاجز نا چیز بے حقیقت +

بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کریگا۔ جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا

تو معلوم ہی نہیں۔ کہ روح کیا چیز ہے۔ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ وقت کے اَزلی اَبدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین اور آسمان میں سماتا نہیں چاہتا * پھر کیسے کیسے لوگ ہو گذرے ہیں۔ کہ اِس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا۔ اور مر گئے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تودۂ خاک ! آخر وہ کیا چیز تھی ؟ جو اُن میں سے نکل گئی۔ حیوانات۔ نباتات۔ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے ؟ کہ یہ کیا ہو رہا ہے ! اور کس غرض سے ہو رہا ہے ! *

(نذیر احمد)

کارخانۂ قدرت

(از ابن الوقت)

کسی کتاب میں نظر سے گذرا۔ کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خُردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سَو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہو گی ؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد

۵۴ میل کے دَل کا ہوائی کُرہ ہے۔ اور اُس میں بھی جان داروں کی (ایسی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے +

ہر چند کارخانۂ قدرت الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا تیقن پیدا ہوگا۔ جس کو میں دین داری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں + اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ یا ایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکر میں ہیں خدا جانے کب سے؟ اور کیوں؟ اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہوگیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیا! سکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔

یہاں روے زمین پر ایک بھُنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل ایک پنکھڑی۔ گھاس کے ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز

کو بھی نظرِ غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و
غایت ہے جس کی تکمیل کا پُورا پُورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔
مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اُس کے پاؤں
کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھنسیں
اُس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے
اُس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے جس میں کئی کئی ہفتوں
کے لیے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے مُلک میں وہ پیدا کیا گیا
ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ
تعجب نہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے
کہ اگر اُس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان
کی چربی بدلِ ما یتحلّل کا کام دے + ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں
کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے
پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں + ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے
جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے + پرندوں کے جُثّے سُبک ہیں۔ تاکہ
ہوا میں اُڑ سکیں + دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جُڑے ہوئے
ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپّو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے
پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں + نباتات میں پھل پھول
کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرد
مُلک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا

نہ کھائیں۔ جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں۔ اُن میں توالد و تناسُل کی کثرت ہے۔ تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہونچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور اُون۔ اِس قسم کے سامان قدرتی اُس کو نہیں دیے گئے۔ جس مُلک میں نباتات کی کثرت ہے۔ وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مُلک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک رُواں صانعِ قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پرزہ ہاتھ ہے کہ دُنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں (اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو اُن تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے) سب اسی پُرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عُمدہ کلیں بنائی ہیں اس میں شک نہیں کہ اِن کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شدومد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دوچار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پُرزے ہزار ہا پیچ۔ بیلن۔ پہیئے۔ چرخیاں۔ کمانیاں خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کیئے ہیں۔ تب کہیں جاکر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لیے کل بنائی گئی ہے یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خُدا کی

بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ۔ کہ ہزار ہا قسم کے کام اِس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کفِ دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ اُنگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلّاح! ✤

اِنسان کے بدن میں ایک اَور ذرّے بھر کی چیز آنکھ ہے۔ اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔ کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے۔ جس میں نگینہ کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔ اوپر بھوؤں کا چھجّے دار سائبان۔ سامنے پپوٹوں کا پردہ۔ پردے میں پلکوں کی جھالر پھر پپوٹے کے اندر مناقذ ہیں۔ جن میں سے آئینۂ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے۔ جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔ گویا اُتنی ہی دفعہ آئینے پر پُچارا پھرتا ہے۔ گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پُچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے ✤

میرا تو کیا منہ ہے۔ کہ موجوداتِ عالم میں جو اَسرارِ حکمت مضمر ہیں اُن کا ایک شمّہ بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اِسی قدر ہے۔ کہ دُنیا کے کارخانے کو اِس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ کل مَیں نے آیت اللہ کا سبق سُنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے۔ کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اُردو میں ترجمہ کر دیے ہیں۔ اُسی میں

لکھا تھا۔ کہ مچھر کے مُنھ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے وہ حقیقت میں ایک تلوا ہے۔ اُس تلوے میں تین اوزار۔ ایک تو سوئی جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے اُس میں اتنی بات اَور بھی تھی۔ کہ اِس شکل خاص میں مچھر کی مدت حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں !۔ اِس طرح کی باتوں کو اگر اِنسان سَرسَری طور پر نہ سُنے۔ جیسی کہ اُس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرہ اِس بات کی گواہی دیگا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانش مند۔ ہمہ داں۔ حاضر۔ ناظر۔ سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ انسان صمیم قلب سے موجودات عالم میں غور اور خوض کرے۔ اور اِس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتّفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اِتّفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور انضباط کا کیا مذکور !اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا؟ کہ دُنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اِس میں رتّی برابر فرق پڑا نہیں ۔ +

(نذیر احمد)

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی

از سفرنامہ

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ۔ جو دُور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اُس کے دو کناروں پر آباد ہے۔ اور اِس وجہ سے اُس کے دو حصّے بن گئے ہیں۔ ایک حصّہ استنبول کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے۔ سلاطین کے مقبرے اِسی حصّہ میں ہیں۔ مُسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔ دوسرا حصّہ پیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور اُس کے انتہائی جانب پر بشکطاس وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں سُلطان کا ایوانِ شاہی اور قصرِ عدالت ہے۔ پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے۔ اور چونکہ تمام بڑے بڑے یوُرپین سوداگر اور سُفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں۔ اُس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ دُنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے۔ کہ منظر کے لحاظ سے اُس سے زیادہ خوش نُما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا۔ اِسی لحاظ سے اِس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی سُنہری سینگ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دُور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے

آگے جو زمین ہے۔ وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اُسکی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے۔ اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہوگیا ہے ؏

شہر کی وسعت تمدّن کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانسو جامع مسجدیں۔ ایک سو اکہتر حمام۔ تین سو چھتیس سرائیں ایک سو چونسٹھ مدارس قدیم۔ پانسو مدارس جدید۔ بارہ کالج۔ پینتالیس کتب خانے۔ تین سو پانچ خانقاہیں۔ اڑتالیس چھاپے خانے ہیں کاروبار اور کثرتِ آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں۔ بارہ دُخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں۔ جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اسکے سڑکوں پہ پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے۔ کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پُل ہے۔ اُس پر سے گذرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اُس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے سے کم نہیں ہے ؏

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں۔ جنکی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے و قہوہ وغیرہ مُہیّا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں۔ جنکے لیئے لکڑی کا پُل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں

اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ اِن تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریاتِ زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سُنتے تھے۔ کہ ہندوستان میں اِس کا رواج نہیں۔ تو تعجّب سے کہتے تھے "وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں" اِن مُلکوں میں دوستوں سے مِلنے جُلنے اور گرمیٔ صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں ❊

افسوس ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو اِن باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ اِس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کِس قدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر اِن کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی دوست کے مکان پر دُو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ میں دو بڑے نقص ہیں۔ اوّل تو تفریح کے جلسے پُر فضا مقامات میں ہونے چاہییں۔ کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحّت بدنی کو فائدہ پہونچے دوسرے سخت خرابی یہ ہے۔ چونکہ یہ جلسے پرایوٹ جلسے ہوتے ہیں اِس لئے اُن میں غیبت۔ شکایت اور اِس قسم کی لغویات کے سِوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمعِ عام کی وجہ سے اِس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اِس قِسم کے تذکرے نہیں سُنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا ❊

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو۔ تو یہاں دیکھ سکتا ہے کتب فروشوں کی دُکانوں کی سیر کرو۔ تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دُکان ہے۔ سنگ رُخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتابیں جس قدر ہیں۔ مُجلّد۔ اور جلدیں بھی معمولی نہیں۔ بلکہ عموماً مُطلّاً و مُذہّب۔ مالک دکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم سن خوش لباس لڑکے اِدھر اُدھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دُکان میں قدم رکھا۔ ایک لڑکے نے کُرسی لاکر سامنے رکھ دی۔ اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے۔ اور اُس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں +

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔ زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجایش نہیں۔ قیمت چُکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے +

اِسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دُکانیں۔ دونوں نمونہ کی موجود ہیں عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔ **غلطہ** کو دیکھو۔ تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دُکانیں بلند اور آراستہ۔ سڑکیں وسیع اور ہموار۔ کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اسکے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض جگہ اِس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل +

اس شہر میں آکر ایک سیّاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے دو حصّوں میں اس قدر اختلافِ حالت کیوں ہے؟ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا میں نے اس کے متعلّق کچھ بحث و تفتیش کی۔ باشندوں کے اختلاف حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کر لیا۔ یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا تموّل لیکن سڑکوں اور گزرگاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنی حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری مینوسپلٹی کے ٹیکس بہُت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں۔ لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس لئے مینوسپلٹی اُن رقموں کو فیّاضی سے صرف کر سکتی ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے۔ یا اب اُن کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے کہ اُس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے *

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جُدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ۔ چہ منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں

تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے اُمرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا۔ کہ دو چار گھر آگ سے جلکر تباہ نہوں۔ اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اِس کام پر مقرر ہیں ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں۔ فوراً خبر کریں۔ اِس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سَر ہوتی ہیں۔ اور شہر کے ہر حصّے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہونچ جاتے ہیں۔ اُنکو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُنکی جھپیٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ مَیں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پہونچتا ہے +

آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا۔ اِس قدر خوش گوار ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجّب ہے کہ ہمارے یہاں کے اُمرا شملہ اور نینی تال کی بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے؟ پانی پہاڑ سے آتا ہے۔ اور نہایت ہاضم اور

خوش گوار ہے۔

(شبلی نعمانی)

مصر کی قدیم یادگاریں

آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اِس شہر کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے۔ کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سوادِ شہر کے ویرانوں میں اِس وقت تک سیکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں۔ جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجکو اِتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ اِتنی ہمّت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور انھیں کے حال کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

اَہرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں۔ جن کی نسبت عام روایت ہے۔ کہ طوفان نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اِس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے۔ کہ یونان کی علمی ترقی سے اِن کی عُمر زیادہ ہے۔ کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ **مینار** نہایت کثرت سے تھے یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدّین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیے گئے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں۔ اور جن پر خاص طور سے اَہرام کا اطلاق ہوتا ہے۔ صرف تین ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے اُس کی لمبائی چار سو اسّی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دُگنی ہے۔ نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع سات سو چھہتر فیٹ ہے۔ مینار کا مکعب

آٹھ کروڑ نوّے لاکھ فیٹ ہے۔ اور وزن اٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن اِس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے۔ جڑ میں تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتھر کی چٹانیں ہیں۔ اور چوٹی پہ جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں آٹھ فیٹ کی ہیں +

اُس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مُربع چبوترہ ہے اُس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اسیطرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ پتھروں کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا دراز کا معلوم ہونا تو ایک طرف۔ چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اِس پر استحکام کا یہ حال ہے۔ کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے +

ان میناروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ جرِ ثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔ کیونکہ اِس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جرِ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے۔ اور اگر اس ایجاد کو زمانۂ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں۔ تو جرِ ثقیل سے بھی بڑھ کر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑے گا +

ان میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے۔ کسیقدر خراب ہو گیا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ ۹۳ھ ہجری میں ملک العزیز

(پسر سُلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اِس کو ڈھانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اِس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے برباد کر دیے گئے۔ لیکن بجز اِس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب ہوئی۔ یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اُکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا +

اَھرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے جسکو یہاں کے لوگ ابوالہول کہتے ہیں۔ اُس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن مَلا ہے جس کی آب اِس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مُناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہو گا۔ باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اِس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں۔ کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں۔ عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا۔ کہ آپ نے دُنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی؟ اُس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب"۔ کیونکہ عالمِ قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں۔ اُس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں +

(شبلی نعمانی)

مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ لکھنوی

بزمِ قدرت

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہوجاتی ہیں۔ مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل جسمیں انقلابات عالم سے ہر روز نیا ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے ہمیشہ آباد رہی اور یونہیں قیامت تک جمی رہیگی۔ یہ وہ محفل ہے جسکی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پُرغم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جنسے ہماری محفلیں درہم و برہم ہوجایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزمِ قدرت کی رونق اور دوبالا ہوجاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلائے دشت غربت ہوجاتا ہے۔ تو برسوں ہماری انجمنیں سونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذر اجل ہوجاتا ہے۔ تو سالہا سال کے لئے وہ ماتم کدے ہوجاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو تو اُس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پُرجوش زندہ دل ایسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کرجاتی ہیں ایک شاعر کا قول ہے

دُنیا کے جو مزے ہیں۔ ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے۔ افسوس! ہم نہ ہوں گے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزمِ قدرت ہمیشہ یونہیں دلچسپیوں سے آباد رہیگی۔ ہاں ہم نہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لاکے بٹھا دیگا

کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگیں گی +

الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا۔ جو اِس بزم کی رونق کو ترقّی دیتا رہا۔ اِسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے۔ کہ زمانہ کی عام رفتار ترقّی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ اور مُلک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ اور اُن کو دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ زمانہ تنزل پر ہے مگر اصل پوچھیے تو تنزل صرف اُن کی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے دنیا اپنی عام رفتار میں ترقّی ہی کی طرف جا رہی ہے +

اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزران رہے ہو ذرا بزم قُدرت کو دیکھو تو کِس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمھارے دِل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا۔ کہ اِن چیزوں کی قدر کر سکو یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں۔ اور طبیعت میں وہ مفید جوش پیدا کرتی ہیں۔ جنسے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہوں گے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے تارے کِھلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دِکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوش نما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی تری و تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ ماہتاب آسمان کے نیلگوں اطلسی

دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لے کے آیا تھا لیکن خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کر کے بزم قدرت میں نہایت لطیف اور خوش گوار دل چسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحنِ فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہو گیا۔ ابھی آسمان کو اُس مہمان کا انتظار تھا جس سے نظامِ عالم کا سارا کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب و تاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اُترے ہوئے چہرہ کو چھپا کے غائب ہو گیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزمِ قدرت کے دلفریب ایکٹروں سے خالی ہو گیا۔

خوابِ شب کا مزا اُٹھانے والوں کی آنکھیں کھل کھل کے اُفقِ مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اِسکے ساتھ مُرغانِ سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور آنکھیں ملکے دیکھا ہے۔ تو ہماری نظر کی خیرگی نہ تھی۔ شمعِ حقیقت میں جھلملا رہی ہے ایک بیک وُفورِ طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے گھنٹے بجے۔ چڑیاں چہچہائیں۔ موذنوں نے اذانیں دیں۔ اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے مِلکر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہو گئی بلاغِ نیچر کے چابکدست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے نسیمِ سحر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابطہ و متین غنچوں کے پہلو گدگدانے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔

(عبد الحلیم شرر)

خان بہادر شمس العلما مولوی محمدؐ ذکاء اللہ

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق وعادات

شاید کوئی اور دوسرا مُدبر و منتظم ملکی ایسا گذرا ہو۔ کہ جس کی تفضیح اور ہجو اس مبالغہ سے اور تعریف اس شد و مد سے ہوئی ہو۔ اور اُس کی ساری زندگی کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری سے ہوئی ہو۔ مگر اُس کی نسبت لکھنے والے طرف دار اور متعصب تھے۔ اگر نظرِ انصاف سے دیکھیے۔ تو اُس میں یہ بھلائیاں اور برائیاں معلوم ہونگی۔ جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اُس کی فطانت اور فراست وذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اس میں شبہہ نہیں کرتا۔ کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا۔ کہ اُمورِ خطیر اور معاملات عظیم کے انصرام اور سرانجام کرنے کی اُس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ برسوں تک اُس نے ایک سلطنت بزرگ اور مملکت عظیم کا نظم ونسق کیا۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش پرلے درجے کا تھا۔ کاہلی اُس سے کروڑوں کوس دُور رہتی تھی اُس کے جانشین جو ہوئے۔ اُن میں دو چار قابلیت اور لیاقت میں تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت ومشقت وکارگزاری میں کہیں اُس سے ملتے تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا۔ جس نے یہ سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے علیٰحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اِس کے لئے ضرور ہے کہ

وہ اور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے یہی باب فتح ونصرت کی کنجی ہے۔ یہی وہ روشن عقل تھا کہ اُس شاہراہ پر انگریزی گورنمنٹ کو رستہ دکھایا۔ جس پر چلنے سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہونچ گئی گو یہ خیالات اُس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے۔ مگر بُری بھلی طرح سے تجربہ ہو کر آخر کار وہی صحیح ثابت ہوئے۔

اُس نے انگریزی صوبوں کے حسنِ انتظام میں اپنی عقل وذہن کو بہت خرچ کیا۔ انقلابوں کے طوفان نے سارے مُلک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمعِ افسردہ کی طرح سب میں دُھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں حقیقت میں اُن کے طُفیل وہ ظلم وستم ہوتے تھے کہ قلم لکھ نہیں سکتا۔ اگر زمیندار تھا۔ تو وادے مالگذاری کے لئے سر اُس کا گنجہ بنایا جاتا تھا۔ اگر ساہوکار تھا۔ تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ غرض سارے زمانے کی عافیت تنگ تھی۔ اُس نے ان سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو ان کو اُس نے درجۂ کمال پر نہیں پہونچایا اور نہ ان کو اچھا بنایا۔ مگر وہ ایک بنیاد اُن کی ایسی ڈال گیا۔ کہ پھر اُس پر اَوروں کو ردّے لگا کر عمارت بنانی آسان ہو گئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا۔ کہ جس کی طرف اُس نے توجہ نہ کی ہو۔ اور اُن میں بہت سی باتوں کا موجد نہ ہو۔

اُس نے اپنی سرکار کی ہوا خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر اِس میں اُس نے اَخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اُس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا۔ ازراہِ ظلم و تعدّی جو دولت کا سامان کیا اہل انگلستان نے اُس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اُس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا۔ کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا اور مروّت و فتوّت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب بر خود غلط اِتنا تھا۔ کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اُس کا ایک راز سربستہ اور سرِ پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اُس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہو۔ وجہ اِس کی یہ تھی۔ کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اُس میں جو خوبیاں تھیں۔ وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو بُرائیاں تھیں۔ وہ نفرین کے لائق۔ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ رعایا پروری۔ سپاہ کی دلداری۔ لوگوں کو اپنا کر لینا۔ رفاہیت عباد اور معموریٔ بلاد کا خیال یہ سب خوبیاں اُس میں ایسی تھیں۔ کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوش نُما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اُس کی گنجینۂ مالی دولت افزائی ایسی ایک بلّی اُس میں تھی۔ کہ وہ اِس طوطی خوشرنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اِس بلّی کے بھنبوڑنے کے لئے اُس کے پاس ایک کُتا بھی موجود تھا۔ جو اُس کی خود پرستی و خود رائی تھی

غرض یہ فضائل اور رذائل اُس پتے کام کر رہے تھے۔ جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلی اور کتّا کام کریں ہیسٹنگز صاحب کی سب سے زیادہ تعریف اِس بات میں تھی۔ کہ اُس نے سارے کارخانوں اور کاموں کے لئے خود ہی مقدّمات کو ترتیب دیا اور اِس بات کو سرانجام کیا۔ جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا۔ تو طفل مکتب تھا۔ نوکری ملی تو تجارت کے کارخانے میں کبھی اُس کو اہل علم اور منتظمان مُلکی کی صحبت بھی میسّر نہ ہوئی۔ جتنے اُس کے یہاں جلیس و انیس تھے اُن میں کوئی اُس سے زیادہ صاحب لیاقت نہ تھا۔ کہ اُس کی لیاقت کو بڑھاتا بلکہ اُس کو خود اُستاد بنکر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ سب کا رہنما تھا اور اُس کا رہنما فقط اُس کی عقل و دانش کا نور تھا +

(محمد ذکاء اللہ)

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضت محمودہ اور کوشش وسعی کے ہیں جس سے کسب و فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں +

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا۔ کہ بے ادب اُسے دیکھکر باادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے۔ وہ اور

آہوؤں کو پکڑلاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے۔ اُس کا فکر اِستاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے ✤ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا ساخندہ کر۔ کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے۔ کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں۔ وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے۔ اگر تمھاری داڑھی کوؤں کے پروں کی سی سیاہ ہو۔ تو بڈھوں کی بگلا سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اُڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اُسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دُنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سُرخ وسفید تھا۔ ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا۔ کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے" تجھے چاہیئے کہ جو تیرا عیب بیں ہو۔ تو اُس کا ہنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے۔ تو اُس کو نبات دے۔ جو تجھے مارے۔ تو اُسے آبِ حیات پلا۔ تا کہ تیری عقل سلامت پسند ہو۔ اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں باواز بلند پڑھا جائے۔ خدا سے توفیق ادب کی دعا مانگ۔ کیونکہ ادب کے بغیر لطفِ رب سے آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لئے بُرا نہیں ہوتا۔ بلکہ اَوروں کے لئے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے۔ ادب اِنسان کو معصوم بناتا ہے۔ گستاخی اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے ✤

(محمد ذکاءاللہ)

حیا

حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے اور بیحیائی بھی قسم قسم کی۔ سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبت میں اندھا ہونا ہے۔ جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ ایک شخص جو سرشتِ انسانی سے بڑا ماہر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ "آدمی اپنے سے سب کے بعد محبت کرے"۔ مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں اُن صفات کا یقین کرتے ہیں جو درحقیقت اُن میں نہیں ہوتیں۔ اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ یہی سخت عیب ہے جس سے انسان جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے۔ اور ذلت اُٹھاتا ہے۔ خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ جب آدمی خودستائی کرتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ وہ کوئی بڑی قابلیت و قدر و منزلت کا آدمی ہے۔ تو ضرور اُس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے۔ تو اُس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور عجز و انکسار اختیار کرنا چاہیئے جب آدمی اپنی نیک صفات کو۔ جو حقیقت میں اُسکے اندر ہیں۔ نمود کے ساتھ دکھائے گا۔ تو شیخی کرکری ہو جائیگی +

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ مغرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ مغرور اپنی نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عبث کرتا ہے۔ وہ اپنے دُسنے گنے

زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھونکوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اور اُس کے تمام زور کو اپنے سے دُور کر دیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی فروتن۔ متواضع۔ منکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر سے ٹال دیتا ہے۔

سفلے کم ظرف ناشائستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں سچے مہذب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی لیاقت رکھتے ہیں۔ وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں وہ اپنے میں یہ نہیں دیکھتے ہیں۔ کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ۔ کیا نہیں جانتے جتنا اُن کا علم بڑھتا ہے۔ اُتنا ہی اپنی جہالت کے علم سے اُن کی حیا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں ایک عمق کے بعد دوسرا عمق اُنکے آگے ہوتا ہے۔ اُسکی تھاہ کبھی اُن کو نہیں ملتی۔ یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں۔ کہ جلدی سے تھاہ کو پاکے خوش ہو جاتے ہیں اور اُس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔ عالموں کی نظروں کے روبرو۔ پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے جس سے اُن کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے۔ جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے اُتنی ہی اُن کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے ✢

(محمد ذکاء اللہ)

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے خواہ وہ کسی جماعت کا ہو۔ جو شریف شرافت نسبی اور شرافت حقیقی تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے۔ وہ اپنے دل سے اس امر کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے۔ کہ بہبود عوام اور رفاہ انام میں سعی کرکے محنت میں اپنا حِصّہ لوں۔ اس کو ہرگز یہ گوارا سے خاطر نہیں ہوتا کہ میں اَوروں کی محنت سے کھاؤں پیوں۔ میں فراغت سے رہوں اور اس کا معاوضہ خود محنت کرکے اپنی سوسائٹی کو نہ دوں — عالی خیال نیک کردار اس تصور سے بھاگتا ہے کہ یونہیں بیٹھا رہے اور دعوتیں اُڑایا کرے۔ اور اس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔ نکما پن اور سستی نہ کوئی عزت ہے۔ نہ کوئی منفعت ہے۔ اس سے فرومایہ اور کمینہ طبائع راضی ہو جاویں۔ مگر عالی ہمت تو ایسی حالت کو ذلت سمجھتے ہیں۔ اور حقیقی عزت اور عظمت سے اُسے بعید جانتے ہیں +

ایک دانشمند بلند خرد جو خود جد و جہد میں مجتہد تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ یہ پند سود مند ارقام فرماتا ہے۔ کہ "اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدت سے زور دے کر نہیں جما سکتا۔ کہ ہر امیر۔ شریف۔ غریب۔ فقیر کی شرط زندگی محنت ہے۔ غریب کسان روٹی اپنی پیشانی کی عرق ریزی سے کماتا ہے۔ اور امیر اپنے شکار کی جستجو میں سعی کرکے اپنی سستی کو کھوتا ہے

جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر ہل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں لگتا۔ ایسے ہی مزرعۂ دل میں تخم علم بغیر محنت کے بارآور نہیں ہوتا۔ مگر ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے۔ کہ ایسے اتفاقات اور واقعات پیش آسکتے ہیں۔ کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اس کی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اُس سے متمتع ہو۔ مگر علم میں یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ آتش زدگی یا وقوع حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعۂ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہو جائے اور یہ ثمر دوسرے کو ملجائے۔ اُس کے تحصیل علم کی تکمیل اور توسیع خاص اُسی کی ذاتی منفعت کے لیے ہے۔ اسی واسطے میرے پیارے بچے! محنت کر اور وقت کو اچھی طرح کام میں لا۔ لڑکپن میں ہمارے قد ملکے ہوتے ہیں اور دل ملائم۔ اُس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے۔ آدمی کی بھی عمر میں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں۔ کہ اگر ایک فصل کی کاشت میں غفلت کیجیے۔ تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ پس اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خریف و ربیع کی فصلیں ہیں۔ ضائع کردیں گے۔ تو بڑھاپا ہمارا۔ کہ کھرسا کا موسم ہے نہایت خوار اور ذلیل ہوگا +

(محمد ذکاء اللہ)

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

محمد حسین نام۔ آزاد تخلص۔ دہلوی۔ فنِ شعر میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد علوم عربیہ و فارسیہ میں حظِ وافی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ اُردو میں اِن کی نثر پایۂ عالی رکھتی ہے۔ تشبیہ و تمثیل کا استعمال نہایت خوبی و لطافت سے کرتے ہیں ٭

اُردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں۔ تو گویا وہ ایک اوزار ہے۔ کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچے نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ وہی اِس سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اُس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے۔ کہ اگر چاہے تو باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیار کر دے۔ جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے۔ تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے۔ جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے۔ اِن سے حاصل کر لیتا ہے وہ ایک نادر مُرصع کار ہے۔ کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اُس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیّار ہے۔ جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے

قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے۔ کہ نظر کے میدان میں مُرقع کھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اُسے پھول۔ گُل۔ طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے ❊

اس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح مُوقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوش نما ہیں۔ کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال بھبھوکا کر دیتا ہے۔ پھر بے اِس کے کہ بوند پانی اُس میں ڈالے۔ ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے۔ کہ کبھی نارنجی کبھی گلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سَراپا عالمِ نیرنگ ❊

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گذرے ہیں۔ جن کے مُرقعے آجتک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا اُنکے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مُرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سُن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اوّل

یہ کہ اُس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں۔ مگر ناتمام ہیں۔ اور اُسکے سبب ظاہر ہیں +

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو۔ کُل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُس کی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام اُردو خود کہتا ہے۔ کہ میں علمی نہیں۔ بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ لین دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی ہوں سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے۔ تو اُنھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اُس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ اُن کی فرمائش سے کئی کتابیں۔ کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور اُنہی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا اب خیال کرنا چاہیئے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل ستر بہتر برس کی

ہو۔ اُس کی بساط کیا۔ اور اُس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اِس وقت ہمیں اُس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہیئے +

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی مُلک والے کا یہ کہنا۔ کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی مُلک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بیجا ہے +

عربی بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اُس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ وغیرہ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اِس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل مُلک میں علم آتا ہے۔ پھر علمی اشیاء کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں +

علمی الفاظ کا ذخیرہ خُدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اوّل خاص و عام میں علم پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں مثلاً ریل کا انجن اور اُس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں۔ کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادنےٰ ادنےٰ

ناخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اُس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے یا پہلے یاد کرلتے۔ تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً: عجائب گھر اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اُس کا یہی نام لیں۔ خواہ فانوس جادو نیں۔ خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر مشاہدے میں عام ہوجائے اور گھر گھر میں جاری ہوجائے۔ تو اُلٹے سے اُلٹا اُس کا نام رکھ دیں۔ وہی بچّے بچّے کی زبان پر مشہور ہوجائے گا۔ اور وہی سب سمجھیں گے +

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا ایلکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ اُن میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں اس لیے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں۔ کہ سب بے تکلّف سمجھتے ہیں پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے۔ تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہوسکتی ہے۔ تو اہل ملک ہی سے ہوسکتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اُس سے آگاہ کرو۔ جب اُس میں سب قسم کے کاریگر پیدا ہوں گے۔ تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا +

(محمد حسین آزاد)

تذکرۂ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آب حیات اُس پر شبنم ہو کر برسا۔ کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا۔ کہ اِس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا۔ وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستاں رہے۔ نہ اِس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لئے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں؟ جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغبالی نے اِس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ اُنھوں نے اَور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اَور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ +

کیسا مُبارک زمانہ ہوگا جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہونگے تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفلی میں ہوگی صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہونگے۔ اُن نیک نیّت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت آ۔ ایسا بجھ گیا۔ کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اُن کے تحریرِ حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی ہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑ دوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اُس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔ اِسی واسطے میں لکھوں گا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی۔ اس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتبِ تواریخ کے قیمتی سرمایئے تھے۔ وہ دِلّی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علیخاں نے

انھیں معتبر اور با لیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ ۱۲۰۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہوگی۔ کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے۔ تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اِن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّے کے اکثر لڑکے اُنھیں کے پاس پڑھتے تھے انھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوق تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے محلّے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے۔ کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا۔ اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا۔ کہ الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایکدن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا۔ کہ اِس مبارک مہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو۔ اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ اس قدرتی اتفاق کو

مُبارک خاں سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں۔ کہیں بابجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا۔ اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔" غرض کہ اسی عالم میں کچھ۔ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے ÷

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی تبراقی کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی برق سے تھے اور کبھی باد و باراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور انکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے ÷

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک

جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے۔ اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا بعض موقع پر ایسا ہوا۔ کہ شاہ صاحب نے اِن کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا۔ کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہہ دیا یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو بعض غزلوں کو جو اِصلاح دی۔ اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی۔ کہ شاہ صاحب اِصلاح میں بے توجہی یا پہلوتہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی۔ کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدّین منیرؔ تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرّشید تھے۔ اُن کی غزلوں میں توارد سے۔ یا خدا جانے کس اِتفّاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اِس لئے اِنھیں زیادہ رنج ہوا +

اگرچہ اِن کی طبیعت حاضر۔ فکر رسا۔ بندش چست۔ اُس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی اِن کا دوست ہمدرد تھا۔ اِس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اِسی قیل وقال میں ایک دن سوداؔ کی غزل پر غزل کہی "دوشِ نقشِ پا۔ آغوشِ نقشِ پا" شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہوکر غزل پھینکدی۔ کہ اُستاد کی غزل پہ غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اِن دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کرکے گھر سے

نکالا۔ مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اُس دن سے
جُرأت زیادہ ہوئی۔ اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے
اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں
کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف
ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے
مشاعرہ میں دیکھتے۔ تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے۔ بلکہ
غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے +

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا
ابوظفر ولیعہد۔ کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشق شیدا تھے
اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لئے دربار شاہی
میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہیں آکر جمع ہوتے تھے اپنے اپنے کلام
سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع
کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار
کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر اِن صحبتوں میں شامل ہوتے
تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت
فکر کو خوب بلند پردازی ہو۔ لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے
بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔
چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہونچے اور اکثر دربار
ولیعہدی میں جانے لگے +

شاہ نصیر مرحوم۔ کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میرمنشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شُقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں مختار کُل تھے اور وہ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو۔ اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا۔ کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینہ بھی ہوگیا۔

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ لکھکر اکبر شاہ کے دربار

میں سنایا جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کیے تھے۔ مطلع اُس کا یہ ہے!۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

اِس پر بادشاہ نے "خاقانی ہند" کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی +

اواخر ایام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدۂ غرّا لکھکر نذر گزرانا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ لکھکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے!۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ہجری جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(محمد حسین آزاد)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ عرف۔ چندے آسد پھر غالب تخلص کیا۔ سرکار شاہی سے نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا۔ سرکار انگریزی سے پنشن پاتے تھے۔ اکبر آباد مولد دہلی مسکن۔ ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال راہی مُلک بقا ہوئے۔ اِن کا کلام زیادہ تر فارسی ہے۔ اُردو میں ایک مختصر دیوان اور ایک مجموعۂ رقعات ہے۔ اُس زمانہ میں مقفّٰی نویسی کی وبا عام ہو رہی تھی مرزا نے بھی اس کی رعایت کی۔ مگر محاورہ کو اندھا کانا نہیں بننے دیا۔ اِسکے علاوہ لمبے چوڑے القاب و آداب اور تکلفات لایعنی سے انشائے اُردو کو پاک کیا وہ اپنے رقعات کی نسبت خود فرماتے ہیں ''میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مُراسلہ کو مُکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو''

خط ۱

برخوردار! تمھارا خط پہونچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہونچا امیر بن گیا اس باغ کی یہ فصل خزاں ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ اُردو کا دیوان غاصب نا انصاف سے ہاتھ آگیا۔ اور میں نے نورچشم منشی شیونرائن کو بھیجدیا۔ یقین کُلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے جہاں تم ہوگے۔ ایک نسخہ تم کو پہونچ جائیگا۔

طریقۂ سعادت مندی یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جانکر جہاں جاؤ۔ وہاں سے خط لکھتے رہو۔ اور اپنے مسکن کا پتا ظاہر کرتے رہو ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی

شرمندہ بھی ہیں +

راقم اسد اللہ خاں

مرقومۂ شنبہ روز عید مطابق ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۰ء

خط ۲

اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے! کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کُھلتی۔ کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پائچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستاں ایک معشوق خوبروے بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دیدیں اور معلم کو حکم دیا۔ کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا +

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۹۔ ماہ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء

(غالب)

خط ۳

او میاں سید زادۂ آزادہ! دلی کے عاشق دلدادہ!

اردو بازار کے رہنے والے! حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے! نہ دل میں مہر و آزرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی۔ نہ سخندانی۔ کس برتے پر

تِتّا پانی۔ ہائے دِلّی! وائے دِلّی! بھاڑ میں جائے دِلّی! سُنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں ولد دلاور خاں اور نانا اُس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں۔ ولد مصاحب خاں اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ عُمر کیا ہے۔ لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! لکھو اور جلد لکھو ؂

(غالب)

خط ۴

بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا۔ کہ نہ لٹتا؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مُسوّدات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کرلیا کرتے تھے۔ سُو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی۔ نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے۔ اور وہ نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آنے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی ستائش میں

اِس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اسکے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں۔ تو نسخۂ موسوم بہ دستنبو مطبع مفید خلائق آگرہ سے منگالیں +

(غالب)

خط ۵

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام۔ نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اِس فن میں تم یکتا ہو خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں۔ کہ ہتھنی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مؤنث ہے بے شبہ و شک والسلام +

(غالب)

خط ۶

بندہ نواز! زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:-

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جنسے خط و کتابت رہتی ہے۔ اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ اُن میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں اُن سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مُراسلت کا اتفاق ہوتا ہے۔ پارسی مکتوبوں۔ رسالوں۔ نسخوں اور کتابوں کے مجموعے شیرازۂ بستہ ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔ جاں کنی کے خیالات نے مجکو ان کی تحریر سے دست بردار و آزاد و سُبک دوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجمُوع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں اُنھیں کو جناب احدیت جلت عظمتہٗ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع ارباب فن فرمائے۔ میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہونچکر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا۔ تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس امیدوار ہوں۔ کہ آپ اُنھیں نذور محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اُردو سے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش و فرو ماندۂ کشاکش

معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوئے ہوس تعقید
معنوی کو حضور خود جانتے ہونگے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل
و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہذا خامہ فرسائی بروے کار
نہیں آئی *

(غالب)

خط ۷

سبحان اللہ! سر آغاز فصل میں ایسے ثمرہاے پیش رس کا پہونچنا
نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر رسّب النوع اثمار ہے۔ اس کی
تعریف کیا کروں۔ کلام اس باب میں کیا چاہتا ہوں۔ کہ میں یاد رہا اور
اہدا کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو باایں ہمہ رواں پروری
و کرم گستری و یاد آوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت
کہار پہونچا اور اسی وقت جواب لے کر اور آم کے دو ٹوکرے دیکر
روانہ ہو گیا یہاں سے اس کو حسب الحکم کچھ نہیں دیا گیا۔

(غالب)

خط ۸

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہونچے۔ مکرمی مولوی غلام غوث
خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں پھوڑا
پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے۔ کہ خدا کی پناہ!
ضعف کیونکر نہ ہو! برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی

عمر جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اُس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا
سن کہاں؟ جو آپ پھر تولید دم صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں
اور ناتوان اور آپ کی پُرسشہائے دوستانہ کا ممنون احسان
والسلام مع الاکرام۔

(غالب)

خط ۹

پیرو مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار۔ گویا اِس در کا فقیر تکیہ دار
ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں اور بریلی
کہاں! ۱۳۔ اکتوبر کو یہاں پہونچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤنگا
نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے
جس کو دُنیا کہتے ہیں۔ دل بھر گیا۔ اب عالم بیرنگی کا مشتاق ہوں
لاالہ الا اللہ۔ لاموجود الا اللہ۔ لامؤثر فی الوجود الا اللہ۔

(غالب)

خط ۱۰

قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک
ہفتہ گذرا ہوگا۔ کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا۔ کہ آپ کو اس کی
اطلاع دوں۔ خانۂ کاہلی خراب! آج لکھوں۔ کل لکھوں۔ اب کون
لکھے! کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی۔ غالب! اس وقت نہ لکھ۔ سہ پہر
کو لکھیو۔ آج دوشنبہ ۲۳۔ جولائی کی بارہ پر دو بجے ہرکارہ سے

آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا۔ مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم رہے۔ کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشائے اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے۔ "کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہونچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائیے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام" یہ تحریر اس ہفتہ میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعۂ نثر اُردو کہاں ہے! یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کرینگے۔ کتاب کے باب میں سرمد کی رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے:۔

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست　　　　مے باید دید و دم نمے باید زد

بوستانِ خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار معرضِ طبع میں ہے اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو۔ تو جتنے مجلد فرمائیے۔ اُس قدر بھجوا دوں۔ چھ روپیہ مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اُسی مطبع میں جس میں حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے ہفتہ کو دو ورقہ بھیجدوں گا۔ بشرطِ پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجے گا جناب کیمسن صاحب افسر مدارسِ غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اُس

کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اُردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیجدیا نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا۔ مگر یہ لکھا۔ کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع وحصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیجدوں گا۔ زیادہ حدادب۔ نامۂ جواب طلب ‎

(غالب)

خط ۱۱

قبلہ! پیری وصد عیب۔ ساتویں دہائی کے مہینے گن رہا ہوں قولنج آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے۔ اگر مفقود نہ کہو۔ تو بمنزلۂ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا ایک حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ جُرعہ جُرعہ پیتا ہوں۔ مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا۔ کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں + میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اُس کا نہ بصورت پارسل بلکہ بلفِ خط ہذا بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے سو نقل کر لیجیے۔ میرا مدعا اس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے اگر آپ کی پسند آئے یا اور اشخاص خریدنا چاہیں۔ تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ذِمّہ خریدار ہے ‎

(غالب)

از مؤلف

جنگ مرہٹہ و دُرّانی

احمد شاہ والی کابل ہندوستان پر تین حملے کر چکا تھا اور صوبۂ پنجاب کو ممالک محروسہ میں شامل کر کے نجیب الدولہ رُہیلہ کو شاہ دہلی کی امداد کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مگر مغلیہ اُمرا کو خود غرضی اور نا اتفاقی کے مرض نے ایسا چر لیا تھا کہ ایک کو ایک کھائے جاتا تھا۔ اِدھر عماد الملک وزیر دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لایا۔ اُدھر آدینہ بیگ خاں سابق صوبہ دار پنجاب نے مرہٹوں اور سکھوں کی کمک سے کر دُرّانیوں کو اٹک پار بھگا دیا۔ اب سواحل دکن سے وادی اٹک تک مرہٹوں کا پھریرا لہرا رہا تھا اور ہندوستان کی کھونٹ کھونٹ میں اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ناچار نجیب الدولہ نے احمد شاہ کو عرضی لکھی۔ کہ حضور والا جلد تشریف لائیں اور ہماری ننگ و ناموس کو مرہٹوں کے دست تعدی سے بچائیں ورنہ یہ قوم تخت مغلیہ کو اُلٹ دیگی اور ہمارا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیگی۔

اِس عرضداشت کو پڑھ کر احمد شاہ پھر عازم ہند ہوا اور زیر دامن کوہِ ہمالہ کوچ کرتا ہوا۔ بلا تعرض سہارنپور تک آ پہونچا۔ یہاں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں وغیرہ سرداران رُہیلہ باریاب ملازمت ہوے اور دُرّانی فوج کی کمک لے کر مرہٹوں کو نواح دہلی سے مار پیٹ کر نکال دیا

اور جب تک جنبل پار نہ ہو گئے۔ اُن کا پیچھا نہ چھوڑا ٭

مرہٹوں کا سردار راگھوباجی۔ ہندوستان سے جب اس ناکامی کے ساتھ واپس گیا۔ تو بھاؤ جو مرہٹوں کا وزیرِ اعظم اور سپہ سالار تھا اُس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکی۔ اس وقت مرہٹوں کا اقتدار منتہاے عروج پر پہونچ گیا تھا۔ آراستہ رسالے۔ باقاعدہ پلٹنیں۔ اور عمدہ توپخانے اُن کے پاس موجود تھے۔ اُن کے دربار کی شان و شکوہ بھی مغلیہ دربار سے ہمسری کا دم بھرتی تھی۔ لہذا بھاؤ ایک لشکرِ عظیم فراہم کر کے بڑے کرّوفر کے ساتھ دلی کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ مغلیہ سلطنت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک دے اور اس کاخِ کہن کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ جب وہ دلی کے زیرِ فصیل آپہونچا۔ تو دُرّانیوں کی قلیل جماعت ایک خفیف مقابلہ کے بعد پسپا ہو گئی۔ بھاؤ نے دلی پر قابض ہو کر مساجد و مقابر اور محلات شاہی کو خوب تاراج کیا۔ دربارِ عام کا نقرئی کٹہرا اکھڑوا کر اور بیگمات کا زیور تک اُتروا کر گلا ڈالا۔ اگر اَور سردار مانع و مزاحم نہ ہوتے۔ تو بھاؤ آمادہ تھا۔ کہ بسواس راؤ کو تختِ دہلی پر بٹھائے اور چار دانگ ہند میں مرہٹوں کا سکہ چلائے۔ مگر یہ کام اس وقت تک ملتوی کیا گیا۔ کہ دُرّانیوں کو ہزیمت دے کر اٹک پار بھگا دیں۔ اس لئے مرہٹوں کا لشکر آگے بڑھا اور کنج پورہ کے قلعہ کو جہاں معدودے چند دُرّانی قابض و متصرف تھے محصور کر لیا ٭

اِس وقت احمد شاہ دُرّانی گنگا کنارے **انوپ شہر** کے مقام پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا اور شجاع الدولہ کو اپنی رفاقت پر مائل کر رہا تھا مرہٹوں کی یورش کے اخبار وحشت آثار سُنکر اُس نے چھاؤنی توڑی اور محصورین کنج پورہ کی اعانت کے لیے بر سبیل استعجال روانہ ہوا۔ **باغپت** کے گھاٹ اُس نے دریاے جمن کو عبور کرنا چاہا۔ مگر دریا تھا طغیانی پہ اور اسباب گزارہ مفقود۔ ناچار اور آگے بڑھا اور کنج پورہ کے محاذات میں پہونچکر اُس نے ایک تیر ترکش سے نکالا۔ اُس پر کچھ دم کر کے دریا میں پھینکا اور لشکر کو حکم دیا۔ کہ فوراً گھوڑے دریا میں ڈالدو۔ وہ خدا کے حکم سے تم کو راستہ دیگا۔ اس تدبیر سے اس کا سارا لشکر پار اُتر گیا یہاں خبر لگی۔ کہ ایک دستہ فوج مرہٹہ کا سنبھالکہ کے سرائے پر قابض ہے۔ لہذا قشون دُرّانی کا ہراول اُن کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور کامیاب ہوا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی فتح تھی۔ مگر دُرّانی لشکر اسکو فال فیروزی سمجھکر بہت خوش ہوا ؎

اب دُرّانیوں کی آمد آمد سُنکر مرہٹوں نے بھی کنج پورہ سے کوس مراجعت بجایا اور دونوں لشکر نواحی پانی پت میں خیمہ زن ہوئے مرہٹوں کے لاؤ لشکر کی بھیڑ بھاڑ اس قدر تھی۔ کہ آج تک نولاکھ نیزہ زبان زد عوام ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ جنگ مہا بھارت کے بعد سرزمین ہند میں ایسا گھمسٹ فوجوں کا کبھی نہیں ہوا۔ خیر یہ سب مبالغہ سہی مگر اِس میں شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کی جمعیت مع بھیڑ بنگاہ بقول

بعض تین لاکھ اور بقول بعض پانچ لاکھ کے قریب تھی خاص قشون دُرانی چالیس ہزار اور ہندوستانی سرداروں کی ماتحت فوجیں پچاس ہزار تھیں۔ مرہٹوں کا توپخانہ دو سو توپوں سے زیادہ۔ مگر دُرانیوں کی طرف صرف تیس توپیں تھیں +

کچھ عرصہ تک دونوں لشکر مقابل ہو کر پڑے رہے اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک بار بھاؤ کے حکم سے گوبند رائے بندیلہ ایک دستہ فوج کا لیکر رہیلکھنڈ وا دوہ پر تاخت کرنے کے لئے نکلا ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر شاہ دُرانی کو پہونچائی۔ شاہ نے سردار عطائی خاں کو جو قندھار سے تازہ وارد ہوا تھا۔ اُس کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ سردار مذکور اپنے ماتحت سواروں اور کچھ رہیلوں کو ساتھ لے راتوں رات یلغار کر کے صبحدم گوبند رائے کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اُس کو تہس نہس کر کے گوبند رائے کا سر شام تک بادشاہ کے سامنے لا رکھا گاہ بیگاہ رسد لانے والے گروہوں میں بھی جھڑپ ہو جاتی تھی + غرض کئی مہینے تک پڑے پڑے طرفین کے سپاہی اور سردار تنگ آ گئے اِدھر تو ہندوستانی سردار احمد شاہ سے ملتجی ہوئے۔ کہ ایک فیصلہ کی جنگ کیجیے۔ جو ہونا ہو سو ہو جائے۔ اُدھر مرہٹے سردار بھاؤ سے متقاضی تھے۔ کہ لشکر میں غلہ اور سامان کا قحط ہے۔ یوں فاقوں مرنے سے تو بہتر ہے۔ کہ بر سر میدان لڑکر مریں +

آخرکار شجاع الدولہ کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کا پیغام

بھیجا۔ احمد شاہ نے جواب دیا۔ کہ جنگ وپیکار کا معاملہ میری رائے پر رکھو اور صُلح کرنی ہو تو تم لوگ مختار ہو۔ جو اپنے حق میں مصلحت سمجھو کرو۔ شجاع الدّولہ تو صلح و آشتی پر مائل تھا۔ الاّ نجیب الدّولہ اُڑ بیٹھا اور سب ہندوستانی سرداروں کو سمجھایا۔ کہ اگر اِس وقت مرہٹے کورے نکل گئے تو یاد رکھنا کہ آیندہ تمھاری خیر نہیں۔ غرض صُلح کا معاملہ جھمیلے میں پڑگیا۔ دوٹوک فیصلہ قرار نہ پایا۔

ابھی پیک وپیام آجارہے تھے۔ کہ آخرِ شب کو جاسوسوں نے خبر دی کہ مرہٹوں کا لشکر ایک زبردست حملہ کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ خبر شجاع الدّولہ نے احمد شاہ کو پہونچائی۔ وہ اپنے خیمہ سے ہتھیار لگائے باہر آیا اور فوج کو آگے بڑھنے کا حکم سُنایا۔ مگر شاہ کو اس خبر کی صحت میں ہنوز تردد تھا۔ کہ یکایک مرہٹوں کے توپخانہ کی زبردست فیر نے اُس کی تصدیق کردی +

جب مرہٹوں کا توپخانہ باآہستگی آگے بڑھتا چلا آیا۔ یہانتک کہ اُسکے گولے دُرّانی لشکر کے سَر پَر سے گذرنے لگے۔ تو مرہٹوں کے جنرل ابراہیم گردی نے فیر بند کرادی اور اپنی پلٹنوں کو آگے بڑھاکر سنگینوں سے حملہ کیا۔

اِس حملہ نے رُوہیلوں کی صف کو جو دُرّانیوں کے بازوے راست کی محافظ تھی بالکل زیر وزبر کردیا۔ اور اِس کے ساتھ ہی ایک دم فوج سے بسواس راؤ نے درانیوں کے قلب لشکر پر جہاں احمد شاہ

کا وزیر حکم رانی کر رہا تھا سخت یورش کی۔ اس چپقلش میں وزیر کا برادر زادہ عطائی خاں کام آیا اور دُرّانیوں کے قدم اکھڑنے لگے یہ کیفیت دیکھ کر وزیر اور اُس کے رفقا گھوڑوں سے کود پڑے اور عزم بالجزم کر لیا کہ بغیر مرے مارے میدان کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

اس وقت گرد و غبار کی وجہ سے ہنگامۂ نبرد کا کچھ حال معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون غالب اور کون مغلوب ہے؟ مگر دُرّانیوں کے نعرے اور ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کم ہوتی جاتی تھی۔ اِس لئے محمد شاہ نے فوراً ایک دستہ وزیر کی کمک کے لئے عقب سے روانہ کیا اُس کے پہونچتے ہی پھر گرما گرمی سے آتش جدال و قتال مشتعل ہوگئی اور خوب جم کر گھما گھمی سے لڑائی ہونے لگی۔ طرفین کے دلاور شور ما دست بدست اور سینہ بسینہ ڈٹ گئے۔ کہیں تلوار سے تلوار اور کہیں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔ نیزوں کی سنانیں اور سنگینوں کی نوکیں برق خاطف کے مانند کوندرہی تھیں بھاؤ اور بسواس اپنی فوجوں کو بڑھا بڑھا کر مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ ظاہرا مرہٹوں کا پلہ بہت بھاری نظر آتا تھا۔ اور دُرّانی دبتے چلے جاتے تھے۔ مگر عین وقت پر احمد شاہ کو وہ چال سوجھی کہ طرفۃ العین میں بازی کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق سواران صف شکن کا دستہ۔ جو اُس کی فوج کا چیدہ حصّہ تھا۔ گھوڑوں کو سرپٹ اُڑاتا۔ کاوا کاٹ کر نکلا اور یکایک غنیم کے بائیں بازو پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ ٹوٹ پڑا ؎

یہ حملہ نہ تھا بلکہ سحر و افسوں تھا۔ جس کے اثر سے مرہٹوں کی دل بادل فوجیں کائی کی طرح پھٹ گئیں۔ کچھ ایسی ہل چل مچی۔ کہ بالکل حواس باختہ ہو گئے اور جینٹی جتائی بازی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پھر تو دُرّانیوں اور رُہیلوں نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ کشتوں کے پُشتے اور مقتولوں کے انبار لگا دیے۔ بیس بیس کوس تک غنیم کا پیچھا دبائے چلے گئے اور جہاں مرہٹہ سپاہی پایا۔ وہیں اُس کو ٹھکانے لگایا یہاں تک کہ اسیرانِ جنگ پر بھی کچھ رحم نہ کیا جو اُن کی تیغ بے دریغ سے بچ نکلا۔ اُس کو دہاقین نے سنگوایا۔ بھاؤ۔ بسواس اور دیگر چیدہ سردار مرہٹوں کے وہیں کھیت رہے۔ صرف ہلکر و سیندھیا زندہ بچے جب بقیۃ السیف اپنے ملک میں پہونچے ہیں۔ تو تمام دکن میں گھر گھر کہرام مچ گیا۔ کوئی قریہ اور قصبہ ایسا نہ تھا جہاں سے نالہ و فغاں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ ایسی خوفناک تباہی مرہٹوں پر کبھی نہ پڑی تھی اور بعد ازاں پہلی سی شان و شوکت اُن کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مورخین دقیقہ سنج نے مرہٹوں کی ہزیمت کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ وہ زور بازو و نیروے جسمانی میں خلقۃً اپنے حریف کے مد مقابل نہ تھے اِس لئے شدائد جنگ و مصائب رزم کو زیادہ برداشت نہ کر سکے۔

(محمد اسمٰعیل)

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ واجد علی شاہی دور کے بڑے مشہور نثار مقفیٰ نگار تھے یہ طرز انشا جو کہ سراسر تکلف تھی۔ اُس پُرتکلف زمانہ میں چندے مقبول رہی۔ مگر اب تو بالکل مُردہ و افسردہ ہوگئی ہے ؞

جاڑے کی شدت

ناگاہ ایک روز گذر موکب حشمت و جلال۔ بافر و شوکت کمال۔ ایک صحرائے باغ و بہار دشتِ لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر۔ بوباس ہر برگ گل کی رشک مشک اذفر۔ صفحۂ بیاباں معنبر و معطّر۔ چشموں کا پانی صفا میں آب گوہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلّہ کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی پرند اور چرند اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے۔ بھوک اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھر تھراتے تھے سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے منھ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی۔ منھ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کے پانی میں بھاگ جاتا تھا۔

زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔ اشکِ شمع انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے لحاف میں منھ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا۔ پگلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینہ میں آگ تھی۔ گواہ شرعی شرر تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنورِ فلکِ چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ لُنجوں نے بٹیر پاڑی۔ لوے لولوں کے ہاتھ آئے لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سرزمین ہند میں مُردے نہ جلتے تھے زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رخسارِ گلِ شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی۔ مرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتّے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ عذارِ لالۂ حُمرا رشکِ زعفراں تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں۔ کہربائی پتّے۔ بہار میں رنگِ خزاں تھا۔ اس سردی کا کہیں ٹھکانا تھا۔ حمّام نہ خانہ کا خس خانہ تھا۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے۔ زردشت کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ آفتاب عازمِ برجِ حمل تھا۔ آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیستِ سمندر کے عنوان تھی۔ آگ میں خلقت کی جان تھی۔ جاڑے

میں ہر ایک الست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا تمام اہل لشکر کو تپ لرزہ کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے اینٹھے جاتے تھے۔ ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے تپنچے۔ چقماق۔ پتھر کلے لاٹھی سے بیکار ہو گئے تھے چاپ سے پتھر آگ نہ دیتے تھے۔ اور توڑے دار کا یہ حال تھا بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اُٹھانا محال تھا۔ تو ڑا ہر ایک گل تھا۔ توتے کی جگہ شور بلبل تھا۔ ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کیچڑے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے۔ ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے۔ جگنو کو چنگاری کے دھوکے اُٹھانے کو تھم گئے تھے۔ سردی بس کہ کارفرما تھی۔ ایک کو دوسرے کی تمنا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالمگیر ہوا تھا کہ کرۂ نار زمہریر ہوا تھا۔

(سرور لکھنوی)

میر امن دہلوی

میر امن دلّی کے رہنے والے تھے۔ بتلاش معاش چندے عظیم آباد میں قیام کیا وہاں سے چل کر کلکتہ پہونچے۔ جان گلگرسٹ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ صاحب موصوف کی فرمایش سے ۱۸۰۱ء میں قصہ چار درویش کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اُن کی نثر اس زمانہ کے روزمرہ اُردو اور محاورات دہلی کا نہایت فصیح و صحیح نمونہ ہے +

قصّہ

یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ چوپڑ گنجفہ شطرنج۔ تختہ نرد کھیلا کرتا یا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یاروں آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا۔ باز۔ بہری۔ جرّہ۔ باشہ۔ سرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا دُور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا۔ کہ جدھر نگاہ جاتی کوسوں تک سبزے اور پھولوں سے زمین لال نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا۔ کہ ایک کالا ہرن۔ اُس پر زربفت کی جھول اور جھنور کلی مرصّع کی۔ اور گھنگرو سونے کے زردوزی پٹے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے

خاطر جمع سے اُس میدان میں۔ کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پَر نہیں مارتا۔ چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پاکر چونکا ہوا سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔ مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ کہ رفیقوں سے کہا۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ میں اِسے جیتا پکڑوں گا خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرند تھا۔ کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر۔ اُنکی کر چھالوں کو بُھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اُس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہوا۔ گھوڑا ابھی باؤ سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن اُسکی گرد کو نہ پہونچا۔ وہ رہوار پسینہ پسینہ ہو گیا اور میری بھی جیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی۔ پر ہرگز کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں! کہاں سے کہاں نکل آیا؟ ناچار ہو کر اُس کو بُھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قربان سے کمان سنبھال کر چلّے میں جوڑ کشش کان تک لا کر ران کو اُس کی تاک "اللہ اکبر" کہکر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پاؤں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُسی کوہ کا ارادہ کیا اور اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔ جب پاس پہونچا ایک باغچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوہ ہو گیا۔ میں نہایت تھکا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھونے لگا ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں

آئی جیسے کوئی کہتا ہے "اے بچے! جس نے مجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُس کو میرا سا دکھیا بنا دے۔" میں یہ سن کر وہاں گیا۔ تو دیکھا۔ کہ ایک بزرگ ریش سفید اچھی پوشاک سے پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے اُس کی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بددعا دیتا ہے میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ "حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی خدا کے واسطے معاف کرو۔" بولا کہ "بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر انجان تجھ سے یہ حرکت ہوئی۔ تو اللہ معاف کریگا۔" میں پاس جا بیٹھا۔ اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اُس پیر مرد نے حاضری جو اُس وقت موجود تھی مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔ ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ وزاری کی کان میں آئی آنکھیں مَل کر جو دیکھتا ہوں۔ تو نہ اُس مکان میں وہ بُڈھا ہے نہ کوئی اَور ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے +

(میر امّن دہلوی)

حصہ نظم

مثنویات

از خواجہ الطاف حسین حالی

حُبِّ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو!
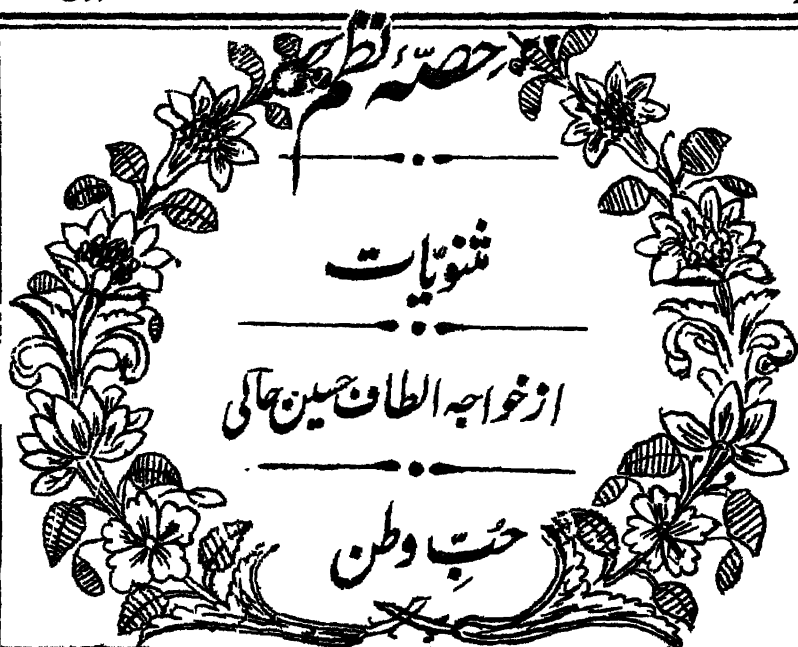
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا!
اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا!

اے عنادل کے نغمۂ سحری!
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری!

اے نسیمِ بہار کے جھونکو!
دہرِ ناپائدار کے دھوکو!

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اِک اِک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوش حال۔ گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب
دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغِ شتاب

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال
شبِ مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؟

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے موردِ آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار
یا کہ سب تجھ پہ ہیں فدا اے یار!

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن! تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے — روکھ تجھ بِن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے — لُوں نہ ہرگز۔ اگر بہشت مِلے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

اے دل! اے بندۂ وطن! ہشیار! — خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او نشاطِ خودی کے متوالے! — گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حُبِّ وطن! — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی — لو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار — پھرتے آنکھوں میں ہیں دَر و دیوار

کیا وطن کی یہی محبت ہے — یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے

اِس میں انسان سے کم نہیں ہیں درند — اِس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹھکرے ہوتے ہیں تنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں رُوکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا — کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آکے کابل سے یاں بہی و انار — ہو نہیں سکتے بار آور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے — ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دُور — اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں ۔۔۔ جان کے اُن کی لالے پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری ۔۔۔ اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہیے حبِّ وطن اِسی کو اگر ۔۔۔ ہم سے حیوان نہیں ہیں کچھ کمتر

بیٹھے بے فکر کیا ہو۔ ہموطنو! ۔۔۔ اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

مَرد ہو۔ تو کسی کے کام آؤ ۔۔۔ ورنہ کھاؤ۔ پیو۔ چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لُطف اُٹھاؤ ۔۔۔ دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک ۔۔۔ کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ۔ تو جی میں تم شرماؤ ۔۔۔ ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار ۔۔۔ زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا ۔۔۔ اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو ۔۔۔ واں مُیسّر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ۔ تو پہلے لو خبر اُن کی ۔۔۔ جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو۔ تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ ۔۔۔ کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر ۔۔۔ ہے کوئی اُن میں خشک کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند ۔۔۔ کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند

مُقبلو! مُدبروں کو یاد کرو ۔۔۔ خوشدلو! غمزدوں کو شاد کرو

جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ ۔۔۔ تیرنے والے ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر ۔۔۔ لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

(حالی)

برکھا رُت

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی

قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لئے کتابِ عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خُدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اِک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

منھ کا ہے زمین پر دڑیڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منھ پر
اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور
ہے چار طرف برس رہا نور

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے "پیہو پیہو"
اور مور جھنکارتے ہیں ہر سو

کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا ہے دل میں چبھی جاتی

مینڈک ہیں جو بولنے پہ آتے
کہسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر
پانی میں نگر، کچھار میں شیر

زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلاّش ہیں اپنی کھال میں مست

ابر آیا ہے گھر کے آسمان پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زبان پر (حالیؔ)

از مثنوی سحر البیان مصنفہ میر حسن دہلوی

میر غلام حسن نام۔ حسنؔ تخلص۔ شرفائے دہلی سے تھے۔ فن شعر میں میر دردؔ اور مرزا سوداؔ سے مشورہ کرتے تھے۔ ایام شباب میں دلی سے فیض آباد آئے۔ پھر لکھنؤ۔ وہیں یہ مثنوی لکھی۔ جس سے بہتر اردو میں کوئی مثنوی نہیں ہوئی۔ بیان سادہ پُر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور۔ جس معاملہ کو بیان کیا ہے اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم
جھکا جس کے سجدہ کو اوّل قلم

سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں
کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا
ہوا حرف زن یوں کہ ربّ العلا

نہیں کوئی تیرا۔ نہ ہوگا شریک — تری ذات ہے وَحدَہٗ لَاشَرِیک

پرستش کے قابل ہے تو۔ اے کریم — کہ ہے ذات تیری غَفُورُ الرَّحِیم

رہِ حمد میں تیری عَزَّ وَجَلّ — تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل

وہ الحق۔ کہ ایسا ہی معبود ہے — قلم جو لکھے۔ اُس سے افزود ہے

تر و تازہ ہے اُس سے گلزارِ خلق — وہ ابرِ کرم ہے ہُوا دارِ خلق

اگرچہ وہ بے فکر غیور ہے — ولے پرورش سب کی منظور ہے

کسی سے برآوے نہ کچھ کامِ جاں — جو وہ مہرباں ہو۔ تو کُل مہرباں

نہاں سب میں اور سب میں ہے آشکار — یہ سب اُس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار

اُسی سے ہے کعبہ اُسی سے کنشت — اُسی کا ہے دوزخ۔ اُسی کی بہشت

وہ ہے مالک الملکِ دُنیا و دیں — ہیں قبضہ میں اُس کے زمان و زمیں

نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے — وہ کچھ شے نہیں۔ پہ ہر اک شے میں ہے

نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں — ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

تامل سے کیجے اگر غور کچھ — تو سب کچھ وہی ہے۔ نہیں اور کچھ

دیا عقل و ادراک اُس نے ہمیں — کیا خاک سے پاک اُس نے ہمیں

وصفِ سخن

پلا مجھ کو ساقی شرابِ سخن — کہ ہو جس سے مفتوح بابِ سخن

سخن کی مجھے فکر دن رات ہے — سخن ہی تو ہے۔ اور کیا بات ہے

سخن کے طلبگار ہیں عقلمند — سخن سے ہے نام نکویاں بلند

سخن کی کریں قدر مردانِ کار — سخن نام اُن کا رکھے برقرار

سخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام — جنھیں چاہیئے ساتھ نیکی کے نام
سخن سے سلف کی بھلائی رہی — زبانِ قلم سے بڑائی رہی
کہاں رستم و گیو و افراسیاب — سخن سے رہی یاد یہ نقلِ خواب
سخن کا صلہ یار دیتے رہے — جواہر سدا مول لیتے رہے
سخن کا سدا گرم بازار رہے — سخن سنج اُس کا خریدار رہے
رہے جب تلک داستانِ سخن — الٰہی! رہیں قدردانِ سخن

سواری کی تیاری

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی — کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی
کہا شہ نے بُلوا نقیبوں کو شام — کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
سواری تکلّف سے تیار ہو — مہیّا کریں جو کہ درکار ہو
کریں شہر کو مل کے آئینہ بند — سواری کا ہو لطف جس سے دو چند
رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلے گا گل شہر میں بے نظیر
یہ فرما محل میں گئے بادشاہ — نقیبوں نے سن حکم - لی اپنی راہ
خوشی میں گئی جلد جو شب گذر — ہوئی سامنے سے نمایاں سحر
عجب شب تھی وہ جوں سحر روسفید — عجب روز تھا مثل روزِ امید
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ "بابا! نہا دھو کے تیار ہو"
ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں — عرق آگیا اُس کے اندام میں
تنِ نازنیں نم ہوا اُس کا کل — کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
نہا دھو کے نکلا وہ گل اِس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادہ کو نہلا دھلا
دیا خلعت خسروانہ بنا

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار
کیے خوان گوہر کے اس پر نثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم

برابر برابر کھڑے تھے سوار
ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار

وہ ماہی مراتب۔ وہ تخت رواں
وہ نوبت۔ کہ دولھا کا جیسے سماں

وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما
سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا

وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
قدم با قدم۔ با لباس زری

سوار اور پیادے۔ صغیر و کبیر
جلو میں تمامی امیر و وزیر

ہوئے تجمل سے شاہ کے پھر سوار
چلے سب قرینہ سے باندھے قطار

سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
لباس زری میں ملبس تمام

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو۔ کہ باد بہاری چلی

رعیت کی کثرت۔ ہجوم سپاہ
گذرتی تھی رک رک کے ہر جایگاہ

لگا بچے سے تا ضعیف و نحیف
تماشے کو نکلے وضیع و شریف

نظر جس کو آیا وہ ماہ تمام
کیا اس نے جھک جھک کے اس کو سلام

غرض شہر سے باہر اک سمت کو
کوئی باغ تھا شہ کا اس میں سے ہو

سواری کو پہنچا گئی فوج ادھر
گئے اپنی منزل پہ شمس و قمر

پہر رات تک پہنے پوشاک وہ
رہا ساتھ سب کے طربناک وہ

قضارا وہ شب تھی شب چار دہ
پڑا جلوہ ایسا تھا ہر طرف مہ

نظارہ سے تھا اس کے دل کو سرور
عجب عالم نور کا تھا ظہور

عجب لطف تھا سیرِ مہتاب کا
سکے تو۔ کہ دریا تھا سیماب کا

کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
کہا آج کوٹھے پہ بچھتے پلنگ

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا

جہاں تک کہ چوکی کے تھے باریدار
ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

شہزادہ گم ہو گیا

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں
تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو
نہ وہ گُل ہے اُس جا نہ وہ اُس کی بُو

نہ بن آئی کچھ اُن کو اِس کے سوا
کہ کہتے یہ احوال اب شہ سے جا

ہوا گم وہ یوسف۔ پڑی یہ جو دھوم
کیا خادمانِ محل نے ہجوم

شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی
رہی تھی جو باقی۔ سو روتے کٹی

عجب طرح کی شب تھی سیہ مات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ

سحر تے کیا جیب گریبان چاک
اُڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک

اُٹھا شہر میں سب طرف شور و غل
کہ غائب ہوا اِس چمن سے وہ گُل

غم و درد سے دل جو سب کا بھرا
ہوا باغ بہارا وہ ماتم سرا

وہ لبریز جو نہر تھی جا بجا
سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا

ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ
کیا رخت پانی سے اپنا سیاہ

کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار!
کوئی دل میں روئے کوئی ڈھاڑ مار

جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ
لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

منقّش جہاں تھے وہ رنگیں مکاں
ہوئے سب وہ جوں دیدۂ خوں چکاں
گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل
سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل
نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا
فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا
وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ
کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
کہا گو جدائی گوارا نہیں
ولیکن خدائی سے چارا نہیں
خدا کی خدائی تو معمور ہے
غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے
یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پر
بہر نوع رہنے لگے یک دگر
لٹایا بہت باپ نے مال و زر
ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر

شادی کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز
چڑھا بیاہنے وہ مہِ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار
بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے
سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
بکورے وہ نوبت کے اور ان کے بعد
گرجنا وہ دھوسوں کا مانندِ رعد
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے
پتنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے
ہوائی ادھر اور ادھر جوق جوق
وہ آوازِ سرنا - وہ آواز بوق
وہ ابرک کی ٹٹی وہ بینے کے جھاڑ
کہے تو - کہ تنکے کی اوجھل پہاڑ
دو رستہ برابر برابر وہ تخت
کسی پر کنول - اور کسی پر درخت
اناروں کا دغنا بھچپنے کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار — ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
جب آئی وہ دولہن کے گھر پر برات — کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات!
بلوریں دھرے شمعداں بے شمار — چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے — دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت۔ کہ بس — ہلے ایک سے ایک سب پیش و پس
وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا — برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان — پلا سب کو شربت دیے پاندان
وہ سب ہو چکے جب کہ رسم رسوم — سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا۔ وہ ٹونے کا وقت — وہ دولہن کی رخصت۔ وہ رونے کا وقت
وہ دولہن کا رو رو کے ہونا جدا — وہ ماں باپ کا اور رونا جدا
نکلتے وہ جانا محل سے جہیز — کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز
یہاں موت ہے اہلِ عرفان کو — کہ جانا ہے اک دن یونہیں جان کو
وہ جو دردمندی سے ہیں آشنا — وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

شہزادہ کا ملنا

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل — کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ گل
خبر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو — کیا گم انھوں نے وہیں آپ کو
لگے رونے آپس میں تو زار زار — کہا ہائے! ہم کو نہیں اعتبار
کہا سب نے صاحب! چلو تو سہی — کہ بیٹا تمھارا وہی ہے! وہی!
مکرر سنا جب کہ بیٹے کا ناؤں — چلا پھر تو روتا ہوا ننگے پاؤں

جونہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں — چلا سر کے بل سب بے نظیر جہاں

گرا پاؤں پر کہہ کے یہ باپ کے — "خدا نے دکھائے قدم آپ کے"

سُنی یہ صدا جونہیں اُس ماہ کی — تو اُس غم رسیدہ نے اک آہ کی

ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے — کہ یوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے

ہوئے شاد و خرم صغیر و کبیر — چلے لے کے نذریں امیر و وزیر

مے عیش سے سب کو مستی ہوئی — نئے سر سے آباد بستی ہوئی

در آمد ہوا گھر میں سروِ رواں — لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں

کہ اتنے میں آگے نظر جو پڑی — تو دیکھا کہ ہے راہ میں ماں کھڑی

بہی چشم سے آنسوؤں کی قطار — گرا ماں کے پاؤں پہ بے اختیار

وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے — یہ روئی کہ آنسو کے تارے چلے

ہوا اور بیٹے کو چھاتی لگا — وہ دونوں کی دو ہاتھ سے لی بلا

ہوئی جان اور جی سے اُن پر نثار — پیا پانی اُن دونوں پر وار وار

وہ آنکھیں جو اندھی تھیں روشن ہوئیں — زمینیں جو تھیں خشک۔ گلشن ہوئیں

زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ — دوبارہ اُنھوں نے کیا اُس کا بیاہ

بنا اُن کی تقدیر کا جو بناؤ — نکالے اُنھوں نے یہ سب دل کے چاؤ

ہوا شہر پر فضل پروردگار — وہی شاہزادہ۔ وہی شہریار

وہی بلبلیں اور وہی بوستاں — شگفتہ گل و مجمع دوستاں

(حسن دہلوی)

ازمثنوی گلزارِ نسیم

پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم سرکار اودھ کی فوج میں منشی تھے - اور فنِ سخن میں خواجہ آتش کے شاگرد - قصۂ گل بکاولی جو پہلے نثر میں تھا - اُس کو نظم کرکے گلزارِ نسیم نام رکھا تشبیہ و استعارہ اور صنایع لفظی و معنوی سے بیان کو آراستہ اور قصہ کو مختصر کیا ہے میر حسن کی مثنوی کے بعد یہی مثنوی ہے جو مقبولِ عام ہوئی -

۱

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر — حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے

ختم اِس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

۲

روداد زبانِ باستانی — یوں نقل ہے خامہ کی زبانی

پورب میں ایک تھا شہنشاہ — سُلطاں زین الملوک ذیجاہ

لشکر کش و تاجدار تھا وہ — دُشمن کُش و شہریار تھا وہ

خالق نے دیے تھے چار فرزند — دانا - عاقل - ذکی - خردمند

نقشہ ایک اُور نے جما یا — پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

تھا افسرِ خسرواں وہ گلفام — بالا تاج الملوک رکھ نام

پر دستے سے نہ دایہ نے نکالا — پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

جب نام خُدا جواں ہوا وہ — مانندِ نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پسر کو ناگاہ

ٹھہرا جب شہ ہوئی خموشی
کی نورِ بصر سے چشم پوشی

دی آنکھ جو شہ نے رونمائی
چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

ہرچند کہ بادشہ نے ٹالا
اُس ماہ کو شہر سے نکالا

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور
خارج ہوا نورِ دیدۂ کور

آیا کوئی لے کے نسخۂ نور
لایا کوئی جا کے سُرمۂ طُور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور
بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے
مختار ہے جس طرح نباہے

۳

تھا اک کحال پیر دیریں
عیسیٰ کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں

وہ مردِ خدا بہت کراہا
سلطان سے ملا کہا کہ شاہا!

تھے باغِ بکاؤلی میں اک گُل
پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل

خورشید میں یہ ضیا کرن کی
ہے مہر گیا اُسی چمن کی

اُس نے تو گُلِ ارم بتایا
لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
رخصت کیے شہ نے چار و ناچار

شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ
لشکر ۔ اسباب ۔ خیمے خرگاہ

۴

وہ بادیہ گرد خانہ برباد
یعنی تاج الملوک ناشاد

میدان میں خاک اڑا رہا تھا
دیکھا تو وہ لشکر آ رہا تھا

پوچھا: تم لوگ خیل کے خیل ... جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل؟"

بولا لشکر کا اک سپاہی ... "جاتی ہے ارم کو فوجِ شاہی

سلطان زین الملوک شہ زور ... دیدارِ پسر سے ہو گیا کور

منظور علاجِ روشنی ہے ... مطلوب گُلِ بکاؤلی ہے"

گُل کی جو خبر سنائی اُس کو ... گلشن کی ہوا سمائی اُس کو

ہمرہ کسی لشکری کے ہو کر ... قسمت پہ چلا وہ نیک اختر

یک چند پھرا کیا وہ انبوہ ... صحرا صحرا و کوہ در کوہ

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے ... گُل کا نہ پتا لگا کسی سے

٥

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار ... یعنی تاج الملوک دل زار

درویش تھا بندۂ خدا وہ ... اللہ کے نام پر چلا وہ

اِک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد ... صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا ... عنقا تھا نام جانور کا

مُرغانِ ہوا تھے ہوش راہی ... نقشِ کفِ پا تھے ریگ ماہی

وہ دشت کہ جس میں تیز تگ دو ... یا ریگِ رواں تھا یا وہ رہرو

ڈانڈا تھا ارم کے بادشاہ کا ... اِک دیو تھا پاسباں بلا کا

بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک ... فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک

حلوے کی بنا کر اک کڑھائی ... شیرینی دیو کو چڑھائی

کہنے لگا۔ کیا مزا ہے دلخواہ! ... لے آدمی زاد واہ وا واہ!

چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو
کیا اس کے عوض میں دوں میں تجھ کو

بولا وہ کہ پہلے قول دیجے
پھر جو میں کہوں قبول کیجے

گلزارِ ارم کی ہے مجھے دھن
بولا وہ ارے بشر! ادھر سن

خورشید کے ہم نظر نہیں ہے
اندیشہ کا واں گزر نہیں ہے

رہ جا! مرا بھائی ایک ہے اور
شاید کچھ اس سے بن پڑے طور

حال اس نے کہا کہ قول ہارا
ہے پیر یہ نوجوان ہمارا

مشتاق ارم کی سیر کا ہے
کوشش کرو کام خیر کا ہے

حمالہ نام دیونی ایک
چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک

خط اس کو لکھا بایں عبارت
"اے خواہرِ مہرباں سلامت!

"پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد
رکھیو اسے جس طرح مری یاد"

"انسان ہے چاہیے کچھ جو سازش
مہمان ہے کیجیو نوازش"

"باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول
مطلوب بکاولی کا ہے پھول"

"دل داغ اس کا برائے گل ہے
نرگس کے لئے ہوائے گل ہے"

خط لے کے بشر کو لے اڑا دیو
پہونچا حمالہ پاس بے ریو

بھائی کا جو خط بہن نے پایا
بھیجے ہوئے کو گلے لگایا

دیوؤں سے کہا کہ جو ہے پہنچاؤ
تا باغِ ارم سرنگ پہنچاؤ

سن حاجتِ نقب بہرِ گلگشت
کترا چوہوں نے دامنِ دشت

جب مہر تہِ زمیں سمایا
اس نقب کی رہ وہ آدم آیا

کھٹکا جو لگا ہیانوں کا تھا
دھڑکا ہی دل کا کہہ رہا تھا

گوشہ میں کوئی لگا نہ ہووے
خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے

گو باغ کے پاسباں غضب تھے
خوابیدہ برنگِ سبزہ سب تھے

پانی کے جو بُلبلوں میں تھا گُل
پہونچا لبِ حوض سے نہ چنگل

یہ شاک اُتار اُتر کے لایا
پھولا نہ وہ جامہ میں سمایا

گُل لے کے بڑھا ایاغ برکف
چوری سے چلا چراغ برکف

گُل ہاتھ میں مثلِ دستِ بیضا
اُس نقب کی آستیں سے نکلا

گُل لے کے جب آیا وہ گلچیں
اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

٦

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغِ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام

جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

مُنھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو۔ وہ گُل ہوا ہُوا ہے
کچھ اَور ہی گُل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گُل
جھنجھلائی۔ کہ کون دے گیا جُل!

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟
ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون!

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
تو ہوکے تو گُل اُڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟

شبنم کے سوا جو آنے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا؟

جس کف میں وہ گُل ہو۔ داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو۔ گُل چراغ ہو جائے؟

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وُہی چشم حوض کا تھا

گلچیں کا جو ہائے! ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منھ سے کچھ نہ چھوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل؟

او بادِ صبا - ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا؟

بلبل! تو چہک اگر خبر ہے؟
گل! تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے؟

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزہ سے راست مو براندام

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزہ کا سا تار تار داماں

دِکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں! بکاؤلی کو!

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی - ہوا ہوئی وہ

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ

جس تختہ میں مثل یاد جاتی
اُس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

(نسیم لکھنوی)

از مثنوی میر تقی

محمد تقی نام میر تخلص شرفائے اکبر آباد سے تھے - دلی پہونچ کر ان کی شاعری نے شہرت پائی شعرائے ماضی و حال نے اُن کو غزل گوئی کا امام مانا ہے - مثنویاں بھی اچھی ہیں - مگر قصیدہ پھیکا کلام اُنکا نہایت صاف و شستہ اور پُر اثر ہے - آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے - سو برس کے ہو کر سنہ ۱۲۱۵ھ میں راہی ملک بقا ہوئے - درد - سودا - مصحفی - انشا - اور جرأت کے ہمعصر تھے -

ضبط کروں میں کب تک آہ اب — چل رے خامہ - بسم اللہ اب
کہہ ٹک - دل کا راز نہانی — ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی - میر اِک خستۂ غم تھا — سر تا پا اندوہ و الم تھا
تاب و تواں و شکیب و تحمل — رخصت اُس سے ہوگئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی — بیتابی نے طاقت پائی
خواب و خورش کا نام نہ آیا — ایک گھڑی آرام نہ پایا
سوز سے چھاتی تابہ گویا — اور پلک خوننابہ گویا
دل میں تمنا - داغ جگر میں — شیون لب پہ - یاس نظر میں
نالے شب کو اُس کے سُن کر — مرگئے کتنے - سر کو دھن کر
روے و جبیں پہ خراشِ ناخن — داغوں سے خوں کے قامت گلبن
غم نے تو دل میں کیا ہی چھوڑا — بر میں تھا اِک پکا پھوڑا
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکیں بے آرامی ہی سے
دشنۂ غم سے سینہ کو چا — ناخن سے منھ سارا نوچا

دل آما جگہ غمنا کی — اور نفس اک تیر خاکی
سے طاقت نے یارا اس کو — ضعفِ دلی نے مارا اس کو
رنگ اڑے چہرہ کا ہردم — تھا گویا گل آخر موسم
رنگ شکستہ۔ لیکہ فسردہ — کہنے کو زندہ۔ لیکن مردہ
دیدۂ تر کے دریا قائل — ساحل خشک لبی کے سائل
ہردم ہو ہر سمت کو جاری — خونباری سے سیل بہاری
خاک بسر آشفتہ سری سے — شورِ قیامت نوحہ گری سے
وادی پر جب اپنے آوے — صحرا صحرا خاک اڑاوے
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ — جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عریاں — بید سا کانپے ہوئے پریشاں
پامالی میں مثلِ جادہ — نقش قدم سا خاک افتادہ
اس کے جو پامال ہوئے سب — خار بیاباں لال ہوئے سب
جس نے دیکھا اس کو یکدم — اس نے کہا یہ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
پر مدت تک یاد رہے گا

(میر)

غزلیات

جہاں اُستاد۔ فصیح الملک۔ نواب مرزا خاں۔ داغ دہلوی

۱

جہاں تیرے جلوہ سے معمور نکلا — پڑی آنکھ جس کوہ پہ طور نکلا

یہ سمجھے تھے ہم ایک چرکا ہے دل پر — دبا کر جو دیکھا۔ تو ناسور نکلا

نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پُورا — مگر ایک نکلا تو منصور نکلا

وجود و عدم دونوں گھر پاس نکلے — نہ یہ دُور نکلا۔ نہ وہ دُور نکلا

سمجھتے تھے ہم داغ گمنام ہوگا — مگر وہ تو عالم میں مشہور نکلا

۲

وہ زمانہ نظر نہیں آتا — کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا

دل نے اس بزم میں بٹھا تو دیا — اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا

رہیئے مشتاقِ جلوۂ دیدار — ہم نے مانا نظر نہیں آتا

لے چلو مجھکو رہروانِ عدم — یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا

دلِ پُر آرزو لٹا لے داغ — وہ خزانا نظر نہیں آتا

۳

دل میں ہے غم و رنج و الم حرص و ہوا بند — دنیا میں گھٹن کا ہمارے نہ کھلا بند

موقوف نہیں دام و قفس پر ہی اسیری — ہر غم میں گرفتار ہوں ہر فکر میں پابند

اے حضرتِ دل! جائیے۔ میرا بھی خدا ہے		بے آپ کے رہنے کا نہیں کام مرا بند
دم رُکتے ہی سینہ سے نکل پڑتے ہیں آنسو		بارش کی علامت ہے۔ جو ہوتی ہے ہَوا بند
کہتے تھے ہم۔ اے داغؔ! وہ کوچہ ہے خطرناک		چھپ چھپ کے مگر آپ کا جانا نہ ہوا بند
	۴	
حضرتِ دل! آپ ہیں جس دھیان میں		مر گئے لاکھوں اِسی ارمان میں
گر فرشتہ وش ہوا کوئی۔ تو کیا؟		آدمیت چاہیئے اِنسان میں
جس نے دل کھویا۔ اُسی کو کچھ مِلا		فائدہ دیکھا۔ اِسی نقصان میں
کس نے مِلنے کا کیا وعدہ کہ داغؔ		آج ہو تم اَور ہی سامان میں
	۵	
خدا دے۔ تو دے اپنا غم ہر کسی کو		کرے پر نہ مائل کِسی پر کِسی کو
نہ کرنا صبا! ایسی دیوانی باتیں		یہ کیا؟ کھینچ مارا جو پتھر کِسی کو
محبّت میں جب جاگئے لٹ گئے ہم		لیا دل کسی نے۔ دیا سر کِسی کو
بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتایئے گا		ستاتے نہیں بندہ پرور کسی کو
	۶	
نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ		بس اب خانہ آباد۔ دولت زیادہ!
وہ تشریف لاتے ہی بولے۔ کہ رخصت		نہیں ہم کو مِلنے کی فرصت زیادہ!
اِلٰہی! زمانہ کو کیا ہو گیا ہے؟		محبّت تو کم ہے عداوت زیادہ!
عدم سے سب آتے ہیں یاں چار دن کو		نہیں ہوتی منظور رُخصت زیادہ!
مری بندگی سے مرے جرم افزوں		ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ!

۷

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی
چمپا کھلی - گلاب کھِلا - موتیا کھِلی

ہم تو اسیرِ دام ہیں صیّاد! ہم کو کیا؟
گلشن میں گر بہار بہت خوش نما کھلی

نالوں سے شق ہوا نہ جگر پاسبان کا
دیوارِ قید خانہ مگر بار ہا کھلی

رونا نصیب میں ہے۔ تو ہنسنا ہو کس طرح؟
تو شکلِ گل نہ بلبلِ خونیں نوا کھلی

داغِ شگفتہ دل کا ذرا دیکھنا اثر
مانندِ غنچہ قبر بھی بعدِ فنا کھلی

۸

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا
جن سے خلش تھی دل میں۔ وہ کانٹے نکل گئے

سچ ہے پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہ طور کے موسیٰ نہ جل گئے

اب کیا ہے! اگر کسی سے ملاتے نہیں نظر
لاکھوں ہماری آنکھ سے جلسے نکل گئے

مرنے کے ساتھ کوئی بھی مرتا نہیں کبھی
فرقت میں رفتہ رفتہ سب احباب ٹل گئے

احباب ڈھونڈھتے ہیں پریشاں ہیں رفیق
کیا جانے! آج داغ کدھر کو نکل گئے

۹

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر - تو کیا غم ہے!

کہتے ہو - کچھ کہو - کہوں کیا خاک!
جانتا ہوں - مزاج برہم ہے

اک جہاں مہرباں ہوا - تو کیا!
مہربانی تری مُقدّم ہے

سُنتے ہیں داغ! کل وہ آئے تھے
بارے اب تو سُلوک باہم ہے

۱۰

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں
یہ نیّت کوئی آج بھر جائے گی

نہ تھی یہ خبر ہم کو۔ اپنی بہار
اِدھر آئے گی اور اُدھر جائے گی

نہ چھوڑیگی دامن کبھی مُشتِ خاک
صبا ہم سے اُڑ کر کدھر جائے گی

دیا دل تو اے داغؔ اندیشہ کیا؟
گذرنی جو ہوگی۔ گذر جائے گی

امیر الشعرا، منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی

۱

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
برنگِ بُو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہُوا

خُدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہُوا

قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھُلے
جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہُوا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو۔ دُرِ یگانہ ہُوا

بچے نہ تنکے ہی تنکے غریب بُلبُل نے
مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہُوا

اُٹھائے صدمے پہ صدمے۔ تو آبرو پائی
امیرؔ۔ ٹوٹ کے دِل گوہرِ یگانہ ہُوا

(۲)

وہ تو سُنتا ہی نہیں میں داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں۔ الٰہی کیا کروں؟

مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس!
چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں

مجھ کو ساحل تک خُدا پہنچائے گا اے ناخدا!
اپنی کشتی کی بیاں تجھ سے تباہی کیا کروں

وہ مرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہے امیرؔ
پیشِ خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں؟

(۳)

انسان عزیزِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو — وہ مہرباں نہ ہو۔ تو کوئی مہرباں نہ ہو
پیری میں بھی گیا نہ تغافل ہزار حیف — اتنا بھی کوئی مائلِ خوابِ گراں نہ ہو
آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہ دیدار ہو نصیب — حاصل جبیں سے کیا؟ جو ترا آستاں نہ ہو
جانے اگر کہ چاہِ عدم میں گرائے گا — کوئی سوارِ توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

(۴)

دل نے جب پوچھا مجھے کیا چاہیئے؟ — درد بول اُٹھا۔ تڑپنا چاہیئے
حرصِ دنیا کا بہت قصّہ ہے طُول — آدمی کو صبر تھوڑا چاہیئے
ترکِ لذّت بھی نہیں لذّت سے کم — کچھ مزہ اس کا بھی چکھنا چاہیئے
ہے مزاج اُس کا بہت نازک امیرؔ — ضبطِ اظہارِ تمنّا چاہیئے

(۵)

کی دل شکنی نہ تند خو کی — سختی پہ بھی نرم گفتگو کی
کی جس پہ نگاہ۔ تجھ کو دیکھا — اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی
جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں — راہیں تو یہی ہیں جستجو کی
دل ہی نہ رہا اُمید کیسی — جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی
کلفت نہ مٹی امیرؔ دل سے — اشکوں نے ہزار شست و شو کی

(۶)

موتی کی طرح جو ہو خداداد — تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے
جاتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں — مجھ کو اے درد! تو بہت ہے

ماننڈِ کلیم بڑھ نہ اے دِل!
اے نشترِ غم! ہو لاکھ تن خشک
کیا غم ہے امیر! اگر نہیں بال

یہ درد کی گفتگو بہت ہے
تیرے دَم کو تو بہت ہے
اِس وقت میں آبرو بہت ہے

از مؤلف

۱

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا
سب جتایا کیے نیاز قدیم
کیا کھلے ؟ جو کبھی نہ تھا نہاں
سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا
تو نہ ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا

تیرا چاہا ہوا بُرا نہ ہوا
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیوں ملے ؟ جو کبھی جُدا نہ ہوا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
اور کوئی ہوا ۔ ہوا ۔ نہ ہوا

۲

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
میں کبھی کا مر بھی رہتا نہ غم فراق سہتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا

نہ جزاے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
کہ جو تم سے کوئی کرتا۔ تمھیں ناگوار ہوتا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا۔ یہی کاروبار ہوتا

۳

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
دوستی اور کسی غرض کے لیئے!

ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
وہ تجارت ہے۔ دوستی ہی نہیں

جامِ وحدت کی دُرد بھی جس نے
نہیں چکھی۔ وہ متّقی ہی نہیں

جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام
غم سے بدتر ہے۔ وہ خوشی ہی نہیں

(۴)

جہاں تیغِ ہمّت علَم دیکھتے ہیں
محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

کمالاتِ صانع پہ جن کی نظر ہے
وہ خوبیِ مصنوع کم دیکھتے ہیں

نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں
انھیں دم بدم تازہ دم دیکھتے ہیں

اڑاتے ہیں جو رخشِ ہمّت کو سرپٹ
وہ منزل کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

(۵)

ہے وصف ترا محیطِ اعظم
یاں تاب کسے شناوری کی

دی زندگی اور اس کا ساماں
کیا شان ہے بندہ پروری کی

کیا آنکھ کو تِل دیا کہ جس میں
وسعت ہے چرخِ چنبری کی

کی بعد خزاں بہار پیدا
سوکھی ٹہنی ہری بھری کی

کیا بات ہے! گر کیا ترحّم
ہیہات! جو تو نے داوری کی

ہر شکل میں تھا وہی نمودار
ہم نے ہی نگاہ سرسری کی

(۶)

راہ و رسمِ خط کتابت ہی سہی
گل نہیں۔ تو گل کی نکہت ہی سہی

بیدماغی بندہ پرور۔ اس قدر
آپ کی سب پر حکومت ہی سہی

بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے
یادِ ایّامِ فراغت ہی سہی

حسنِ صورت کا نہ تھا اصلا فریب!
کلکِ صنعت گر کی صنعت ہی سہی

کچھ نہ کرنا بھی مگر اک کام ہے — گر نہیں صحبت۔ تو عزلت ہی سہی

(۷)

ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے — لیکن کبھی تبدیل جبلت نہیں ہوتی
ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہِ طلب میں — پست اُس سے اولوالعزم کی ہمت نہیں ہوتی
خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اُسے منھ پر — جو بات کہ شائستۂ جلوت نہیں ہوتی
ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت — اِصلاح پذیر اِس لئے عادت نہیں ہوتی
پتے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو — اُس شخص کی دُنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی
ڈھاتی ہے قیامت یہی خونخوار جہاں میں — کچھ غم نہیں ہوتا جو محبت نہیں ہوتی

(۸)

تو جان بیچ کر بھی۔ جو فضل و ہنر ملے — جس سے ملے جہاں سے ملے۔ جس قدر ملے
جب چشمِ آز پھوٹ گئی سب خلش مٹی — اب سنگریزہ ہاتھ لگے یا گہر ملے
ممکن نہیں بغیر قناعت فراغ بال — ہرچند تو دہ تو دہ تجھے سیم و زر ملے
جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز — قسمت سے اِن گنوؤں کے ہمیں چارہ گر ملے

(۹)

غیر توکل نہیں چارا مجھے — اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے
حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا — صبر و قناعت نے اُبھارا مجھے
جو وہ کرے اُس کو سزاوار ہے — چون و چرا کا نہیں یارا مجھے
فرصتِ اوقات ہے بس مغتنم — یہ نہیں ملنے کی دوبارا مجھے
آہ! نہیں رخصتِ افشائے راز — قصہ تو معلوم ہے سارا مجھے

سراج الدّین محمّد ۔ بہادر شاہ ۔ ظفر

سراج الدین محمد نام تھا ۔ بہادر شاہ لقب ۔ ظفر تخلص آخری جانشین شاہانِ مغلیہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے ۔ اِن کا کلام نہایت سادہ و سلیس اور روزمرّہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے ۔

(۱)

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

نہ بھیجا تو نے لکھ کر ایک پرچہ
ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا

نہ بولا ۔ ہم نے کھڑکایا بہت در
ذرا دربان کو کھڑکایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا ۔ تو نے تقدیر!
وہاں تک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

دل اُس کی زُلف میں اُلجھا ہے کب سے
ظفر اِک روز سلجھایا تو ہوتا

(۲)

ہر بات میں تو ایک بھی ہے لاکھ پہ بھاری
گر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا

ہے جامۂ تکلّف کا پسندیدۂ احمق
ہو گا نہ گدھا یہ کبھی اِس جھول سے ہلکا

جز تارکِ دُنیا ہو ہوس سے نہ سبکدوش
یہ بوجھ نہ دُنیا کے ہو مشغول سے ہلکا

صرفہ نہیں کاغذ کا ۔ مگر بھیجتے ہیں وہ
خط ڈاک میں اندیشۂ محصول سے ہلکا

دُنیا میں ظفر جو ہے گرانبارِ جہالت
کب ہوتا ہے وہ مردمِ معقول سے ہلکا

(۳)

آگے پروانہ ہی کیا اِس بزم میں جل بھن گیا!
شمع بھی یاں رو گئی شعلہ بھی یاں سر دھن گیا

جائیے اُس در پہ اور دھونی رما کر بیٹھیے
جوگیا دل سوختہ واں باندھ کر بیٹھن گیا

نام جس کا رہ گیا کچھ اُس کا گُن باقی رہا
ورنہ جو یاں سے گیا ساتھ اُس کے اُس کا گُن گیا

میں صبا! وہ طائرِ بے طاقت اِس گلشن میں ہوں   ایک پر جس کا نہ اُڑ کر تا سرِ گلبن گیا
واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشو و نما!   سبز ہو سکتا نہیں وہ جو کہ دانہ گھن گیا
جاگ اُٹھا خوابِ عدم سے یک بیک سارا جہاں   کان میں جس دم ظفرؔ خالق کا امرِ کُن گیا

(۴)

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ!   اِس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ!
کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تو اگر   از بہرِ نشاں سلیک نشاں بعدِ فنا ہیچ!
ایمان کو نہ دے ہاتھ سے غافل! کہ پسِ مرگ   آنے کا نہیں کام ترے اِس کے سوا ہیچ!

(۵)

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا مثالِ نقشِ پا!   جو کہ مِٹ جانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر
دل سے ہو کیونکر طریقِ آشنائی میں خلاف   آشنا وہ ہے۔ کہ جو ہو آشنا کی راہ پر
ہے صراط المستقیم اُس کے لئے جس نے ظفرؔ   استقامت کی ہے تسلیم و رضا کی راہ پر

(۶)

اِتنا نہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل   دُنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف! پُر غرور! ذرا اپنا ظرف دیکھ   مانندِ جوشِ غم نہ زیادہ اُبل کے چل
فرصت ہے اِک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ   اِس پر سپند وار نہ اِتنا اُچھل کے چل
یہ غول وش ہیں۔ اِن کو سمجھ تو نہ رہنما   سایہ سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل
انساں کو کل کا پُتلا بنایا ہے اُس نے آپ   ق   اور آپ ہی وہ کہتا ہے پُتلے کو کل کے "چل"
پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں۔ کہ رکھ دیکھ کر قدم   کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل؟ چل سنبھل کے چل!
جو امتحانِ طبع کرے اپنا اے ظفرؔ   تو کہہ دو اُس کو طور پہ تو اِس غزل کے چل

۷

نہیں تم کو لازم بُرائی کی باتیں — بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں
غضب ہے! کہ دل میں تو رکھو کدورت — کرو مُنھ پہ ہم سے صفائی کی باتیں
اگر سیدھے ہوتے مرے بخت واژوں — تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں
قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے — اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں
ظفر! کیا زمانہ بُرا آ گیا ہے — جہاں دیکھو ہیں واں بُرائی کی باتیں

(۸)

گرد جو اے شہسوار! آئی نظر اُڑتی ہوئی — تیرے آنے کی ہمیں پہونچی خبر اُڑتی ہوئی
دل جلوں کی ہوتی قسمت میں جو بربادی تو کیوں — پھرتی پروانہ کی خاکستر سحر اُڑتی ہوئی
وہ شکار انداز لے جب ہاتھ میں اپنے تفنگ — برق تھرّا جائے رنگت دیکھکر اُڑتی ہوئی
بے ثباتی کیا کہوں ہستی کی؟ دیکھی ہی نہیں — سرخیٔ رنگِ حنا جلد اس قدر اُڑتی ہوئی
ہے جو کچھ رونق صفائی میں ہے دل کی ورنہ یاں — خاک ہی دیکھی کدورت میں ظفر اُڑتی ہوئی

(۹)

کیا کیا آکر تری محفل میں ہم نے شمع سان! — ہاں! مگر جلکر پڑے دل کی جان کو ہم رو گئے
حضرتِ دل تو گئے سر پہ کر گئے اور اِک ستم — ساتھ اپنے مجکو بھی دونوں جہاں سے کھو گئے
شوق اپنا تم سے دونا ہی محبت میں رہا — جب وہاں سے ایک خط آیا یہاں سے دو گئے

اے ظفر! جاؤ دلِ دیوانہ کو ڈھونڈو کہیں
ہے خدا جانے کہاں؟ مدت ہوئی اُس کو گئے!

ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق

کلام نہایت عام پسند۔ محاورات وضرب الامثال خوب باندھتے ہیں۔ مفصل حال دیکھو صفحہ ۰، حصۂ نثر

۱

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا۔ تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا

مُقدّر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا۔ نہ پایا

سُراغِ عمرِ رفتہ ہو۔ تو کیونکر؟ — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے — نکل جاتے۔ مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا! — دہن پایا۔ لبِ گویا نہ پایا

کبھی تُو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض۔ خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اُس کا کہاں عالم میں! اے ذوقؔ — کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

(۲)

نالہ اِس زور سے کیوں میرا دُہائی دیتا — اے فلک! گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

کون گھر آئنہ کے جاتا؟ اگر وہ گھر میں — خاکساری سے نہ جاروبِ صفائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ۔ اگر دیکھنا ہے ذوقؔ! کہ وہ پردہ نشیں — دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

(۳)

بے نصیب اُس کے ہیں گردیار سے — بسی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے
اُٹھ چکا وہ ناتواں۔ جو رہ گیا — دب کے تیرے سایۂ دیوار سے
اپنے دامن کو بچا کر جائیو — برق! میرے وادیِ پُرخار سے
ناکسوں سے کیا رُکیں وارستگاں! — اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

(۴)

وہ خُلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں — ہے شاخِ ثمر دار میں گل پہلے ثمر سے
فریادِ ستم کش ہے وہ شمشیرِ کشیدہ — جس کا نہ رُکے وار فلک کی بھی سپر سے
اشکوں میں بہے جاتے ہیں ہم سوے درِ یار — مقصود رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے
اے ذوقؔ! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

(۵)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے — اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبّت والے
ہے ہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدّر دونوں — کبھی مِل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وُسعت — تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے
نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار — نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے
نہ ستم کا کبھی شکوہ۔ نہ کرم کی خواہش — دیکھ تو! ہم بھی ہیں۔ کیا صبر قناعت والے
کیا تماشا ہے! کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ — جانتے اپنی حقارت کو ہیں شُہرت والے
کبھی افسوس سے ہے آتا۔ کبھی رونا آتا — دلِ بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

نازاں ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق — اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۶)

نہیں ثبات بلندیِ عزّ و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شَے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
جو پاس مہر و محبّت کہیں یہاں بکتا — تو مول لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لئے
اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو۔ تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے
وبالِ دوش ہے اِس ناتواں کو سر لیکن — لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق! ایک جزوِ ضعیف — اور اِس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

(۷)

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جواب خط — قاصد! جواب زندگی مستعار دے
اے شمع! تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا تو کیا! — مانگو۔ تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے
پشّہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصدِ خوں کو آئے۔ تو پہلے پکار دے
اِس جبر پر تو ذوق! یہ انساں کا حال ہے — کیا جانے کیا کرے! جو خدا اختیار دے

(۸)

لائی حیات۔ آئے قضا لے چلی۔ چلے — اپنی خوشی نہ آئے۔ نہ اپنی خوشی چلے
ہم سا بھی۔ اِس بساط پہ کم ہوگا بد قمار — جو چال ہم چلے۔ وہ نہایت بُری چلے
بہتر تو ہے یہی۔ کہ نہ دنیا سے دل لگے — پر کیا کریں! جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمرِ خضر بھی۔ تو ہو معلوم وقتِ مرگ — ہم کیا رہے یہاں! ابھی آئے۔ ابھی چلے

حکیم مومن خاں۔ مومن

مومن خاں نام مومن تخلص۔ وطن دلّی۔ طبابت پیشۂ آبائی ۱۲۱۵ھ سنہ ہجری میں پیدا ہوئے ۱۲۶۸ھ میں رحلت کی۔ نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے۔ اُن کی روش خاص معاملہ بندی ہے کہیں میر و درد کی سی سادہ بیانی۔ کہیں باریکی۔ ذوق و غالب کے ہمعصر تھے۔

(۱)

وعدۂ وصلت سے ہو دل شاد کیا!
تم سے دشمن کی "مبارکباد" کیا!

کچھ قفس میں اِن دِنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا!

ہیں اسیر اُس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا! صیّاد کیا!

نالہ اِک دم میں اُڑا دے دھوئیں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا!

جب تجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بے وفا! پھر حاصلِ بیداد کیا!

کیا کروں اللہ! سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا! نالہ کیا! فریاد کیا!

اِن نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!

بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس
لب پہ "مومن" ہرچہ بادا باد" کیا!

(۲)

کیا رم نہ کرو گے۔ اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

ہاں جوشِ تپش! چھیڑ چلی جائے۔ کہ پر تو
پھر جائینگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

ناکامیِ اُمید پہ صبر آسکے تو کیا آسکے
ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے۔ اگر الہام نہ ہوگا

(۳)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے! کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
آہ! طولِ امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطرِ مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۴)

قابو میں نہیں ہے دلِ کم حوصلہ اپنا — اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا
لبیکِ حرم ہم ہیں۔ نہ ناقوسِ کلیسا — پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا
تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلہ چند — سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا
اس حال کو پہنچے ترے قصے سے کہ اب ہم — راضی ہیں۔ گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا
انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم — تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

(۵)

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب! — کہیں سایہ مرا پڑا صاحب!
ستم۔ آزار۔ ظلم۔ جور۔ جفا — جو کیا۔ سو بھلا کیا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبشِ لب سے — خیر ہے! میں نے کیا کہا! صاحب
کیوں لگے دینے خطِ آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن! کیجیے بس خدا خدا صاحب!

(۶)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملینگے کسی سے ہم پر کیا کریں! کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
مجھ سے نہ ہو تو تم۔ اِسے کیا کہتے ہیں بھلا! انصاف کیجیے۔ پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
صاحب نے اِس غلام کو آزاد کر دیا! لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کیا گل کھلے گا! دیکھیے! ہے فصلِ گل تو دور اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(۷)

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے کیا علم دُھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے
گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اِک حرفِ غلط لیک اُٹھے بھی۔ تو اِک نقش بٹھا کے اُٹھے
اُف رے گرمیِ محبت کہ ترے سوختہ جان جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے
ہیں دکھاتا تجھیں تاثیر۔ مگر ہاتھ مرے ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دعا کے اُٹھے
شعرِ مومن کے پڑھے بیٹھ کے اُس کے آگے خوب احوالِ دلِ زار سُنا کے اُٹھے

(۸)

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے۔ تو کیا کی
فلک کے ہاتھ سے میں جا چھپوں۔ گر خبر لا دے کوئی تحت الثریٰ کی
جفا سے تھک گئے۔ تو بھی نہ پوچھا کہ تو نے کس توقع پر وفا کی؟

کہا اس شوخ سے "مرتا ہے مومن"
کہا "میں کیا کروں مرضی خدا کی"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مصطفیٰ خان نام۔ شیفتہ تخلص۔ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے جاگیردار اور عمائد دہلی سے تھے۔ ان کی ذات ستودہ صفات امارت۔ فقر اور علم وفضل کی جامع تھی۔ ریختہ میں حکیم مومن خاں مومن سے مشورہ کرتے تھے۔ کلام نہایت متین وسنجیدہ۔ فارسیت کا رنگ غالب ۱۲۸۶ ہجری میں رحلت فرمائی۔

(۱)

اے جانِ بیقرار ذرا صبر چاہیئے
بے شک ادھر بھی آئیگا جھونکا نسیم کا

جس کی سرشت صاف نہو آدمی نہیں
نیرنگ وعشوہ کام ہے دیو رجیم کا

طاعت اگر نہیں۔ تو نہ ہو۔ یاس کس لئے
وابستہ سبب ہے کرم کب کریم کا

جس وقت تیرے لطف کے دریا کو جوش آئے
فوارہ جناں ہو زبانہ جحیم کا

اے شیفتہ! عذاب جہنم سے کیا مجھے؟
میں امتی ہوں نار وجناں کے قسیم کا

(۲)

دلِ زار کا ماجرا کیا کہوں!
فسانہ ہے مشہور سیماب کا

کہاں پھر وہ نایاب! پایا جسے
غلط شوق ہے جنسِ نایاب کا

نہ کیجو غلط۔ اے خوشنوایانِ صبح!
یہ ہے وقت اُن کے شکرخواب کا

محبت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر گُل اور ہر باب کا

وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے
جہاں شغل ہو سیرِ مہتاب کا

میں مجرم رہتا ہوں خائف کہ واں
جفا میں نہیں دخل اسباب کا

نہ کرنا خطا پہ نظر شیفتہ
کہ اغماض شیوہ ہے احباب کا

(۳)

اہل طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ	جتنا زیادہ شغل۔ زیادہ فراغ بال
ہنگام حمد کام میں لائے وہ ایسے لفظ	جن کو ہے معنیِ متعدد پر اشتمال
یہ بات تو غلط ہے۔ کہ دیوانِ شیفتہ	ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ! اس میں کم	ہاں! ذکرِ خد و خال۔ اگر ہے تو خال خال

(۴)

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں	گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور وہ سب سے علیٰحدہ	آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول	کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہئے	جو آفتاب و روشنیِ آفتاب میں
قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو	دیکھو وہ آنکھ سے۔ جو نہ دیکھا ہو خواب میں
مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتا لگے	کھویا ہے ہم نے آپ کو عہدِ شباب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا	وہ سایہ ہوں۔ کہ محو ہوا آفتاب میں
اس صوت جاں نواز کا ثانی نہیں بنا	کیا ڈھونڈتے ہو اب بط و عود و رباب میں
اے آفتِ زمانہ! ترے دور میں شکیب	بلبل کو باغ میں ہے۔ نہ ماہی کو آب میں
بیباک شیوہ۔ شوخ طبیعت۔ زباں دراز	ملزم ہوا ہے۔ پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور!	اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

(۵)

جو کہ ہوا محوِ تجلیِ ذات	خاکِ درِ اس شخص کی اکسیر ہے

کھیل ہے کچھ یہ؟ کہ دکھادوں تمھیں فرض کیا۔ آہ میں تاثیر ہے
خط کے نہ لکھنے کا لکھوں کیا گلہ؟ خامہ! مدد کر۔ دمِ تحریر ہے
کیا کہوں! احباب کی آہن دلی پانوں میں فولاد کی زنجیر ہے
ہم سے وہ ناحق جو خفا ہو گئے شیفتہ! کچھ اپنی ہی تقصیر ہے

(۶)

ستمگر کہے سے بُرا ماننا کیوں! ستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے
جو بیگانہ جانے تجھے خلق۔ کیا غم! اگر آشنا۔ آشنا جانتا ہے
اُسے کُنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت! جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے
بہر صورت آئینہ بھی مُغتنم ہے کچھ آئینِ اہلِ صفا جانتا ہے
ہمیں شیفتہ کی نصیحت سے حاصل! کہ وہ آپ ہم سے سِوا جانتا ہے

(۷)

ابھی کہوں۔ تو کریں لوگ شرمسار مجھے کہ کس کے وعدہ پہ اِتنا ہے اِنتظار مجھے
یہی گمان یہی رشک ہے اگر۔ تو کبھی نہ کوئی دوست ملیگا نہ کوئی یار مجھے
قفس میں کرتی ہے تحریکِ بال جنبانی نوائے دلکشِ مُرغانِ شاخسار مجھے
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غُرور ہو۔ آئے کرے شکار مجھے
رہے سرائر مکتومہ دل ہی میں۔ افسوس! جہان میں نہ مِلا کوئی رازدار مجھے
جفا کو ترک کرو تم۔ وفا کو میں چھوڑوں کچھ اشتہار تمھیں ہو۔ کچھ اشتہار مجھے
جو شور شیں نہ مچاتا۔ اسیر کیوں ہوتا! خراب تو نے کیا۔ جلوۂ بہار مجھے
بڑے فساد اُٹھیں شیفتہ! خدا نہ کرے! کہ اُن کی بزم میں ہو دخلِ اختیار مجھے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ان کے کلام میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بیشتر ہے۔ مگر الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی بے مثل معانی کثیر کو الفاظ قلیل میں بیان کرنا ان کا خاصہ ہے۔ ابتدائے عمر میں دس برس تک بیدل و اسیر کے طرز پر خیالی مضامین لکھا کیے۔ جب تمیز آئی۔ اس دیوان کو چاک کر ڈالا دیوان حال میں کچھ نمونہ ابتدائی کلام کا موجود ہے۔

(۱)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا!
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا؟

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہینگے عرضِ حال اور آپ فرمائینگے کیا!

حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو۔ کہ سمجھائینگے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں!
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا؟

(۲)

یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے۔ یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے۔ اگر اعتبار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو۔ کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو۔ وہ اگر شرار ہوتا

کہوں کس سے میں۔ کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا۔ اگر ایک بار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا۔ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی۔ تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان! غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۳)

ہوئی تاخیر۔ تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!
آپ آتے تھے۔ مگر کوئی عناں گیر بھی تھا!

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا!

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے۔ تو کیا!
بات کرتے۔ کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا۔ نہ سہی!
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

(۱۴)

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں۔ جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے۔ کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے۔ وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے۔ نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

(۵)

کب سے ہوں! کیا بتاؤں! جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اَور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں۔ جو وہ لکھیں گے جواب میں

ہیں آج کیوں ذلیل۔ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر۔ کہاں دیکھیے تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے۔ نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا۔ کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

(۶)

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے! وہ مجلس نہیں۔ خلوت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو۔ جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے۔ برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ!
گر نہیں وصل۔ تو حسرت ہی سہی

(۷)

کوئی دن گر زندگانی اَور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اَور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

دے کے خط مُنھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے

ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

خواجہ حیدر علی - آتش

خواجہ حیدر علی نام - آتش تخلص - اِن کے والد دلّی سے لکھنؤ آئے - خواجہ کو ابتدائے عمر سے شاعری کا چسکا لگا - شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے - غزل گوئی میں شیخ ناسخ سے مقابلہ رہا - ان کے کلام میں لطف محاورات اور گرمی و تاثیر بہ نسبت شیخ ناسخ کے زیادہ ہے -

(۱)

حُسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے - کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کی مانند ہے اُس میں
معمورۂ عالم جو ہے - ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم - کہ حیراں ہوئی - آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ - کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے - وہ شوخ اُس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی جو بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر - وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں - جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگیِ نکہتِ گل ہے یہ اشارہ
جامہ سے وہ باہر ہے - جو دیوانہ ہے اُس کا

یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے - بیگانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۲)

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دُوری میں
تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

ہزاروں حسرتیں جائینگی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابہ میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتش!
سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا

(۳)

نہ بوریا بھی میسر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کیے چھپرکھٹ کا

مطیع نفس نہ اللہ نے کیا مجھکو
نہ میں نے سیر ہی غول کی۔ نہ میں بھٹکا

نہ بھول بیٹھ کے بالائے سرو اے قمری!
چڑھنے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے نٹ کا

عجب بھول بھلیاں ہے غفلتِ ہستی
جسے کہ راہ ہوئی اُس سے۔ خوب ہی بھٹکا

عجب نہیں ہے۔ جو سودا ہو شعر گوئی سے
خراب کرتا ہے آتش! زبان کا چٹکا

(۴)

اے چرخِ بے مروّت! اہلِ بے تنگ مزاجی!
خوش تیرے گھر میں دو دن اک میہماں نہ ٹھہرا

برباد کرنا حق اسے بادِ صرصرا اُس کو
بلبل کا آشیانہ برگِ خزاں نہ ٹھہرا

عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ
کنجِ لحد سے بہتر کوئی مکاں نہ ٹھہرا

پھونک آشیاں ہمارا اے برقِ آتشِ گل!
رہنے کے قابل اپنے یہ بوستاں نہ ٹھہرا

میری ہی خاک پر کی منھ زوری اس نے آتش
پھیروں سمندِ قاتل ورنہ کہاں نہ ٹھہرا

(۵)

مسافر کی طرح رہ خانہ بر دوش — نہیں چاہے اقامت دارِ فانی
یقیں ہے دیدۂ باریک بیں کو — کرے عینک طلب یہ ناتوانی
یہ مشتِ خاک ہو مقبولِ درگاہ — صبا کی چاہتا ہوں مہربانی
سفیدی مو کی ہو کافور ہر چند — کہیں مٹتا ہے یہ داغِ جوانی
نہ خوش ہو فربہیٔ تن سے غافل! — سبک کرتی ہے مُردہ کو گرانی
موے جو پیشتر مرنے سے۔ وہ لوگ — کفن سمجھے قبائے زندگانی
ہوا کوئی نہ حالِ دل سے آگاہ — رہی مشتاق گوش اپنی کہانی
خُدا کے حکم سے ہے قوتِ نُطق — کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی
مرا دیواں ہے اے آتش! خزانہ — ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

(۶)

آنکھوں کو کھول۔ اگر تو دیدار کا ہے بھوکا — چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی
یہ کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے! — پی جائیے گا کس کو، شربت نہیں ہے کوئی
میں نے کہا کبھی تو تشریف لاؤ۔ بولے — معذور رکھیے۔ وقتِ فرصت نہیں ہے کوئی
دل لیجیے جان کے بھی سائل جو ہو تو حاضر — حاضر جو کچھ ہے۔ اس میں حجت نہیں ہے کوئی
ہم شاعروں کا حلقہ۔ حلقہ ہے عارفوں کا — ناآشنائے معنی صورت نہیں ہے کوئی
ہژدہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا — مخلوق چاہیے۔ ایسی خلقت نہیں ہے کوئی
نازاں نہ حسن پر ہو مہماں ہے کوئی دم کا — بے اعتبار ایسی دولت نہیں ہے کوئی
یوں بد کہا کرو تم۔ یوں مال کچھ نہ سمجھو — ہمسایہ بھی خیر خواہِ دولت نہیں ہے کوئی

ماو شما۔ کہ و مہ کرتا ہے ذکر تیرا		اس داستاں سے خالی صحبت نہیں ہے کوئی
	(۷)	
منزل ہی دُور ہے۔ جو یہ پہونچی نہیں ہنوز		دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی
دِکھلائے سیرِ آنکھوں کو بامِ مُراد کی		ایسی کوئی کمند۔ کوئی نردباں نہ تھی
نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدے سے اِبا		ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی
افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجیے!		وہ کون سی بہار تھی۔ جس کو خزاں نہ تھی
کانوں سے ایک دن نہ کیے گرمِ گوشِ یار		آتش! اگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ لکھنؤ کے مشاہیر شعرا سے ہیں اور اپنے وقت کے اُستاد۔ میر تقی مصحفی۔ انشا۔ جرأت کا اخیر زمانہ دیکھا تھا۔ خواجہ آتش کے ہمعصر تھے کلام اُن کا اصول فن کے مطابق نہایت جنچا۔ تُلا۔ تشبیہ و تمثیل سے معمور۔ مگر دلآویزی و تاثیر کم۔

	(۱)	
انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا		جس سینہ میں کینہ ہو۔ وہ سینہ نہیں اچھا
آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے		"مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا
ہو سیر جو منظور دلا بحرِ جہاں کی		جز کشتیِ درویش سفینہ نہیں اچھا
	(۲)	
دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانندِ شمع		افسرِ زر شوق سے رکھ سر پہ نہ اتنا سر اُٹھا
زندگی میں صرف کرتا ہو سکے وُشی حصول		مثلِ قاروں خاک میں جا کر نہ بارِ زر اُٹھا
چاہیئے تعمیرِ دل۔ جو ساتھ اُٹھا لیجائے گا		یوں خرابی کے لئے دیوار اُٹھا یا در اُٹھا

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی
بوجھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا

کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں
زانوے فکرت سے اے ناسخ! تو اپنا سر اُٹھا

(۳)

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

ہوتی ہے غربت میں شدت پر بڑی ایذا کے بعد
رنج اُٹھائے کس قدر یوسفؑ نے کنعاں چھوڑ کر

اعتماد اصلا نہیں گر ہے جہاں زیرِ نگیں
اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر

آج تو پوشاک پر مرتا ہے تو کل دیکھیو
جائیگا نبّاش تیری لاش عریاں چھوڑ کر

(۴)

خوش قدوں کی خاک یہ اُٹھتی ہے ہر دم سرو قد
گرد باد اے اہلِ غفلت! اِس بیاباں میں نہیں

آج نقّاشی کی چھت لگوا نہیں مانع کوئی
کل بجز خفّاش کوئی سقفِ ایواں میں نہیں

دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتنی مثلِ نسیم
گل تو کیا اک خار بھی کچھ دن گلستاں میں نہیں

دُم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیرِ ژیاں
غیرِ روباہ و شغال اب اُن کے ایواں میں نہیں

بے وطن ہو کر زمانہ میں ہوئے نالاں بشر
آشنا نالوں سے ہرگز نے نیستاں میں نہیں

(۵)

دور روزا ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

حاصل تجھے بصارت یعقوبؑ ہو اگر
یوسفؑ بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا بہائے لذتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

(۶)

بیاں کیا ہو سکے عمرِ رواں کی مجھ سے چالاکی
کہ اِس توسن سے لگا ہے نہ تُرکی کو نہ تازی کو

اکیلا دل مرا فوجِ تمنّا کے مقابل ہے
الٰہی کیجیو تو فتحیاب اِس مردِ غازی کو

ثمر پختہ جو ہے (لے خام طبعو!) باغِ عالم میں
نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

(۷)

باشکستہ جو ہے۔ کرتا ہے جہاں میں سلطنت
یہ صدا آتی ہے ہر دم تربتِ تیمور سے

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

بانٹ لے کوئی کسی کا درد۔ یہ ممکن نہیں
بارِ غم دُنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے

دیکھنا اے اہلِ عبرت!) انتقامِ آسماں
بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

شیخ قلندر بخش جرأت

قلندر بخش نام۔ جرأت تخلص۔ اکبرآبادی مشہور ہیں۔ مگر ان کے والد دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں پہونچ کر ان کی غزلوں نے شہرت پائی۔ عین جوانی میں نابینا ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ میر انشا اور مصحفی کے ہمعصر تھے۔ ان کے کلام میں میر کی سی سادہ بیانی اور لطف محاورہ تو ہے مگر مضامین رندی و ہوا پرستی کی حد سے باہر کم نکلتے ہیں ؎

(۱)

غم رو رو کے کہتا ہوں کچھ اس سے اگر اپنا
تو ہنس کے وہ بولے ہے۔ میاں فکر کر اپنا

باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری
غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش پر اپنا
ماتم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا

ہر بات کا بہتر ہے چھپانا ہی کہ یہ بھی
سب ہے عیب۔ کرے کوئی جو ظاہر ہنر اپنا

کیا کیا اسے دیکھ کے آتی ہے جرأت ہمیں حسرت
مایوس جو پھر آتا ہے پیغامبر اپنا

(۲)

بلبل سنے نہ کیونکہ قفس میں چمن کی بات
آوارۂ وطن کو لگے خوش وطن کی بات

عیش و طرب کا ذکر کروں کیا میں دوستو
مجھ غمزدہ سے پوچھیے رنج و محن کی بات

شاید اسی کا ذکر ہو ہر رہگذر میں میں
سنتا ہوں گوشِ دل سے ہر اک مرد و زن کی بات

جرأت خزاں کے آتے چمن میں رہا نہ کچھ
اک رہ گئی زباں پہ گل و یاسمن کی بات

(۳)

صوتِ بلبل دلِ نالاں نے سنائی مجھکو
سیرِ گل دیدۂ گریاں نے دکھائی مجھکو

لائقِ خاطر میں نہیں سلطنتِ ہفت اقلیم
اس گلی کی جو میسر ہو گدائی مجھکو

صلح میں جس کی نہیں چین یہ اندیشہ ہے
آہ! دکھلائیگی کیا اس کی لڑائی مجھکو

وصل میں جس کے نہ تھا چین سو جرأت افسوس
وہ گیا پاس سے اور موت نہ آئی مجھکو

(۴)

آشنا بتلا مجھے ہرجائی ہوں میں یار کہ تو
میں ہر اک شخص سے رکھتا ہوں سروکار کہ تو

کم زبانی مری ہر دم ہے مخاطب بہ جواب
دیکھیں تو پہلے ہم اس بحر سے ہوں پار کہ تو

ناتوانی مری گلشن میں یہی کہتی ہے
دیکھیں اے نکہتِ گل! ہم ہیں سبکبار کہ تو

دوستی کر کے جو دشمن ہوا تو جرأت کا
بیوفا وہ ہے پھر اے شوخ ستمگار کہ تو

(۵)

دی خبر یک بیک صبا نے کیا یہ گلشن میں جو آہ
غنچۂ پژمردہ ساں دل کی کلی مرجھا گئی

ضعفِ پیری روز اس کا انتقام اب ہے آہ
قبل ازیں عمرِ جوانی جو مزے دکھلا گئی

اُس سے کیوں بچئے ہے کیا سودا چڑھا تجکو دلا ۔ وہ نہیں گر آپ میں ۔ تو توہی بس کر جاگئی
اے اجل! بس یہ تو رسوائی نہ دیکھی جائیگی ۔ طبع غمخواروں کی اپنے اب بہت اُکتا گئی
آپ ڈھٹائی سمجھے یا اِس کو جرأت جانیے ۔ آئینگے جی - آئینگے! اب تو طبیعت آگئی

(۶)

مشکل ہے ۔ جو آوے وہ احاطے میں خرد کے ۔ گو اُس کا تصور کوئی ادراک سے باندھے
دعویٰ نہ کرے برق کبھی اپنی تڑپ کا ۔ گر پانوں ترے توسن چالاک سے باندھے
قاتل ہو وہ سنکھ ۔ تو ابھی ڈر کے یہ بھاگیں ۔ جو تیغ و سپر پھرتے ہیں بیباک سے باندھے

سید انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ نام ۔ انشا تخلص ۔ شعرائے دہلی سے تھے ۔ استعداد علمی میں لائق و فائق ۔ فارسی عربی ۔ ترکی کے ماہر ۔ شیخ مصحفی نے ان کو فیضی زماں لکھا ہے ۔ کلام میں ہزل و ظرافت زیادہ ہے ۔ مگر جو صاف اور سنجیدہ ہے وہ بے مثل و نظیر ۔ میر و مصحفی و جرأت کے ہمعصر تھے ۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے ۱۲۳۳ھ میں بحالت دیوانگی انتقال کیا ۔

(۱)

جس شخص نے کہ اپنی نخوت کے پل کو توڑا ۔ راہِ خدا میں اُس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا ۔ افسوس تُو نے ظالم! ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعتِ فرنگی ۔ دل جیب جو ہو رہا ہے ۔ کیا جانیے کہ کس نے ہے اِس کی کل کو توڑا
دارا و جم نے تجھ سے کیا کیا شکست پائی ۔ اے چرخ! تو نے کس کس اہلِ دول کو توڑا
لیتی ہے جنبشِ دل تو ظالم تو آج لے تھپک ۔ بیٹھ جائیگا دگر نہ پھر اِس کا کل کو توڑا
احوالِ خوش اُنھوں کا انشا میاں جنھوں نے ۔ اُس ذاتِ بحت سے مل بندِ اجل کو توڑا

(۲)

جھوٹا نکلا قرار تیرا — اب کس کو ہے اعتبار تیرا

وعدہ کہ کام آ رہے گا — مجھ سا یک رنگ یار تیرا

کر جبر جہاں تلک تو چاہے — میرا کیا! اختیار تیرا

انشاؔ سے نہ روٹھ مت خفا ہو! — ہے بندۂ جاں نثار تیرا

(۳)

شعلے بھڑک رہے ہیں یوں اپنے تن کے اندر — دَوں لگ رہی ہو جیسے گرمی میں بن کے اندر

جو چاہو تم سو کہہ لو۔ چپ چاپ ہیں ہم ایسے — گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر

ق

گل سے زیادہ نازک جو دلبرانِ رعنا — ہیں بکلی میں شبنم کے پیرہن کے اندر

ہے مجھکو یہ تعجب۔ سووینگے پانوں پھیلا — یہ رنگ گورے گورے کیونکر کفن کے اندر

غم نے ترے بٹھایا۔ اے ماہِ مصرِ خوبی! — یعقوب وار ہم کو بیت الحزن کے اندر

یوں بولتا ہے سنتے ہو میر انشاؔ! — ہیں طرفہ ہم مسافر اپنے وطن کے اندر

(۴)

شادابی ہوا میں یہ کیفیّت اب کے ہے — سو رنگ کے شگفتہ ہیں گل شاخسار پر

نظّارہ سوئے دانۂ شبنم اگر کروں — جاتی ہے چٹ نگاہ پھسل سبزہ زار پر

اشجار جھومتے ہیں پڑے صحنِ باغ میں — تاک اینڈتے ہیں مست پڑے جوئبار پر

صحنِ بہار لالۂ خود رو نے۔ اے نسیم! — کچھ آگ سی لگائی ہے آ کوہسار پر

(۵)

نکلے ہے خوں ٹھہر ٹھہر دل سے ہر اک خراش سے — چھیڑ دو اِس کو دوستو! تیز! قلم تراش سے

ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا برابری
ہم ہیں کمینہ اِک غلام فرقۂ خواجہ تاش سے

موسمِ گُل ہے دوستو! جائے وہ سیرِ باغ کو
اُٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہہ فراش سے

حضرتِ عشق او دیر میں رہتے ہو یا حرم میں تم
مجکو نہیں کچھ اطلاع آپ کی بود و باش سے

ہے یہ دو روزہ زندگی ہم کو وبالِ گردن آہ!
اے وہ تو شاد جو چھُٹ گئے دغدغۂ معاش سے

(۶)

یہ جائے ترحّم ہے۔ اگر سمجھے تو صیاد
میں آ کے پھنسوں اس طرح اِس کنجِ قفس میں

آتی ہے نظر اُس کی تجلی ہمیں زاہد!
ہر چیز میں ہر سنگ میں، ہر خار میں خس میں

کیا پوچھتے ہو؟ عمر کٹی کس طرح اپنی
جز درد نہ دیکھا کبھی اِس تیس برس میں

ہر بات میں یہ جلدی ہے۔ ہر چیز میں اصرار
دُنیا سے نرالی ہیں غرض تیری تو رسمیں

انشاؔ ترے گر گوش اصم ہوں نہ تو آوے
آواز تجھے یار کی ہر بانگِ جرس میں

(۷)

نبھ گئی بندۂ درگاہ سے اور آپ سے خیر!
ہم اُلفت میں اگر ایسے ہی آئین ہوئے

راہ رو! چونک۔ کہ ہے قافلہ میں تیاری
محمل اونٹوں پہ بندھے فوج میں سنین ہوئے

قمری و بلبلِ نالاں میں پڑے جو جھگڑے
سو دلِ غمزدہ کے موجبِ تسکین ہوئے

اشک آنکھوں سے قدم رکھ نہیں سکتے باہر
دولتِ شرم سے مانندِ سلاطین ہوئے

قصدِ بنگالہ مناسب ہی نہیں صاحب کو
گرچہ معلوم تجارت کے سب آئین ہوتے

جی ہی اچھا نہ رہا پھر۔ تو عیاذاً باللہ!
فائدہ کیا! جو شہا سارے اراکین ہوئے

(۸)

کر بیٹھے وہیں فضلِ خدا داد پہ تکیہ
جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دو سے

جان اہلِ توکّل انھیں اشخاص کو ۔ جو ہیں
محفوظ پیاز و نمک و گردہ جَو سے

اے دل! وہ خوشا کشت برومند ۔ کہ جس کو
خطرہ ہی نہیں تہلکۂ وقتِ دِرَو سے

افواجِ گل و لالہ میں ہے زلزلہ انشا
اِس بادِ بہاری کی سواری کی جِلَو سے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی نام ۔ مصحفی تخلص ۔ وطن اصلی امروہہ ۔ دلّی میں آکر علوم رسمیہ حاصل کیے ۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ پہونچے ۔ اور ریختہ گوئی میں میرؔ و سوداؔ کے بعد علَمِ اُستادی بلند کیا ۔ خود فرماتے ہیں ؎ اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں ٭ دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا ٭ ان کا کلام نہایت صاف و شستہ ہے کہیں بطرز سوداؔ کہیں بطرز میرؔ ٭

(۱)

نظّارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا
یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

کیا لطفِ مقام اُن کو ۔ جو مشتاقِ عدم ہیں
دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا

کیا بھیجیے قاصد کو وہاں! کوچہ میں جس کے
جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا

تربت پہ مری برگِ گلِ تازہ جو چڑھائے
احسان ہے مجھ پر یہ نسیمِ سحری کا

بندہ ہے ترا مصحفیِ خستہ کو یارب!
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

بوے محبت اپنی رکھّی خُدا نے اُس میں
سینہ میں آدمی کے دل عطرداں بنایا

اپنی تو اِس چمن میں عمر اِس طرح سے گذری
یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

گرم سفر ہیں ہم ۔ منزل کو پر نہ پہونچے
آوارگی نے ہم کو ۔ ریگِ رواں بنایا

اے مصحفی! گریباں سارا لہو سے تر ہے
یہ رنگ اپنا ظالم! تُو نے کہاں بنایا

۳

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا
اپنے رہنے کو مکاں چاہیئے تنہائی کا

شیشۂ دل کو مرے چور کیا کیوں اس نے؟
کیا بگاڑا تھا بھلا گنبدِ مینائی کا

بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا!

مصحفی! ریختہ پہونچا مرا کس رتبہ کو
شوریاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

(۴)

کیا غیر کا کھٹکا ہے؟ کہ میں کچھ نہیں کہتا
یہ منہ تجھے تیرا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

دیوانے جو ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کیا کیا
مجھ کو بھی سودا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

جو چاہتے ہیں۔ مجھ کو وہ کہتے ہیں خدایا!
تو عالم و دانا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے مصحفی! بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل
بعضوں کا مقولا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

(۵)

بوئے خوں دیتا ہے مجھ کو یہ گلشن اے صبا
ہے شہیدوں کا یہاں کس کس کے مدفن اے صبا

کس کے ماتم میں ہیں یہ سب گل ہزاروں سینہ چاک
بلبلیں کرتی ہیں کس کشتہ پہ شیون اے صبا

ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو نے آہ!
لُٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا

ڈال کر شبنم کے منہ سے بے تکلف کان میں
اب کے ہولی میں بنانا گل کو جوگن اے صبا

(۶)

معشوق ہوں یا عاشق معشوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو۔ کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہد تنزیہ کے رخسارہ کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں

ہستی تو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست۔ مگر ہستیِ عالم سے جدا ہوں

انداز ہیں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں
سوزِ جگر و دل ہوں کبھی ناز و ادا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گل و صُبح مُعطّر
میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو ۔ تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی صدا ہوں

یہ کیا ہے ۔ کہ مجھ پہ مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی اشیا میں ہیں مری جلوہ گری یاں
ہر رنگ میں مَیں مظہرِ انوارِ خدا ہوں

(۷)

چہرہ اُتر رہا ہے ۔ نقشے بگڑ گئے ہیں
کچھ ۔ ان دنوں تو تیرے چتون سے جھڑ گئے ہیں

تلوار کھینچ کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر
کشتوں کے ہر گلی میں ستھراؤ پڑ گئے ہیں

روتا پھروں نہ کیونکر میں قافلہ میں ہر سو
منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

اے مصحفی میں رؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۸)

فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ
شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں

یہ درمیاں جو حیتوں بگاڑ رہتا ہے
وہی شریر نہیں ۔ کچھ شریر ہم بھی ہیں

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام اُن کا
کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

(۹)

نو بہار آئی ہے ۔ سودائے کہن تازہ ہوا
سبزہ کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

ہوں وہ غارت زدہ شہر کہ نمودار ہے صاف
میری صورت سے حقیقت مری ویرانی کی

محو ہر دم جو ہے اپنی ہی آرائش کا
اس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

مصحفی یاروں میں یاں ریختہ گوئی کو ملی
قدر شیرازی کی ہو جو وہاں ۔ نہ صفاہانی کی

میر محمد تقی میر

حالات کے لیے دیکھو صفحہ ۲۰ حصۂ نظم

(۱)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا / آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

قافلہ میں صبح کے اک شور ہے / یعنے غافل ہم چلے سوتا ہے کیا؟

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں / تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں / داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز / میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

(۲)

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا / جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش / سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا

ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں / خیال بھی کبھو گذرا نہ پرفشانی کا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں ڈوب گیا / کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

(۳)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا / نہ پیش آئے اگر مرحلہ جدائی کا

یہیں ہیں دیر و حرم اب تو یہ حقیقت ہے / دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا

کسو* پہاڑ میں جوں کوہکن سراب ماریں / خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا

رکھا ہے باز ہمیں دربدر کے پھرنے سے / سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا

جہاں میں میر ہی کے ساتھ جانا تھا لیکن / کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا

* متروک لیکن مستعمل
؂ متروک لیکن اب مستعمل
+ متروک لیکن مستعمل

(۴)

مہر کی تجھ سے توقع تھی ۔ ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو ۔ سو پتھر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اشکِ تر ۔ قطرۂ خوں ۔ لختِ جگر ۔ پارۂ دل
ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہتر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۵)

مستوجبِ ظلم و ستم و جور و جفا ہوں
ہر چند کہ جلتا ہوں ۔ پہ سرگرمِ وفا ہوں

اس گلشنِ دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں
ہوں غنچۂ افسردہ ۔ کہ مردودِ صبا ہوں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب
بارے یہ غنیمت ہے ۔ کہ جیتا تو رہا ہوں

سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک
ہے وقتِ دعا میر ۔ کہ اب دل کو لگا ہوں*

(۶)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے ۔ میں طبعِ رواں ہوں

دیکھا ہے مجھے جس نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
در پے نہ ہو ۔ اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

(۷)

رکھیے گردن کو تری تیغِ ستم پر ۔ ہو سو ہو
جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ۔ ہو سو ہو

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیشِ سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑے دیدۂ تر ۔ ہو سو ہو

* متروک ہے ۔ اب لگاؤں بولتے

بنیں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر	یہ فضولی ہے۔ فقیری میں میسّر ہو سو ہو
صاحبی کیسی؟ جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا	پھر تو خواری بے وقاری بندہ پرور! ہو سو ہو
کہتے ہیں ٹھہرا ہے تیرا اور غیروں کا بگاڑ	ہیں شریک اے میرؔ ہم بھی تیرے ابتر ہو سو ہو

(٨)

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں	مرو یا جیو کوئی اُس کی بلا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اُس گلی میں	کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
اگر چشم ہے۔ تو وہی عینِ حق ہے	تعجّب مجھے ہے عجب ماسوا سے
تنک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر	کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت	کہو میرؔ جی! آج کیوں ہو خفا سے

(٩)

اپنی ہستی حباب کی سی ہے	یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر	یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز	اُسی خانہ خراب کی سی ہے

(١٠)

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم	جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں	رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے
آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو	حیران ہوں میں۔ یہ شوخی آئی تمہیں کہاں سے

اِتنی بھی بدمزاجی! ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

مرزا رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام سودا تخلص۔ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے دلی ان کا مولد و مسکن ریختہ گوئی میں شاہ حاتم کے شاگرد۔ ۱۱۸۰ ہجری میں لکھنؤ چلے گئے ۱۱۹۵ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ ان کا کلام رنگا رنگ ہے۔ کہیں صاف و سادہ کہیں تشبیہ و استعارہ۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال بخلاف میر کے زیادہ اگرچہ اصناف سخن میں استاد مسلم ہیں۔ مگر ان کے قصائد اور ہجویں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

	(۱)	
مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا		جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردہ کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے		کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن	[illegible]	جب چشم کھلی گل کی۔ تو موسم ہے خزاں کا
ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ		دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا
	(۲)	
گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا		لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے		کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا
دماغ جھڑ گیا آخر نہ تیرا۔ اے نمرود!		چلا نہ پشہ سے کچھ بس تری خدائی کا
طلب نہ چرخ سے کر نانِ راحت اے سودا		پھرے ہے اپنا وہ کاسہ لیے گدائی کا
	(۳)	
لطف سے اے اشک! کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں		رحم- اے آتشِ رخسار! کہ جل جاؤں گا
قطرۂ اشک ہوں پیارے! مرے نظارہ سے		کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

اِس مصیبت سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے — تو کہے آج ہی جاؤں کہوں گل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری! کہ میں جوں نکہتِ گل — پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب — اُن کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

(۴)

قاصدِ اشک آ کے خبر کر گیا — قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
دیکھیے! درماندگی اب کیا دکھلائے — قافلہ یاروں کا سفر کر گیا
کیونکر کوئی کھلائے ترا اب فریب — حال مرا سب کو خبر کر گیا
ایک جو مانندِ گل اِس باغ سے — خرّم و خنداں ہو گذر کر گیا
آن کے شبنم کی طرح دوسرا — شام سے رو رو کے سحر کر گیا
کیا تجھے اب فائدہ اِس فکر سے — ہر کوئی اِک طرح بسر کر گیا

(۵)

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم — چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
خُدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے — جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں
مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا — اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

(۶)

مجمر کا دخل کیا ہے محفل میں تفتگاں کی — جو داغ دل کے اپنے ہم عود جانتے ہیں
اپنا چراغ دل کا جس دم سے بجھ گیا ہے — ہم گھر کو آسماں کے یہ دود جانتے ہیں
آئینہ سازی اُن کو ہے کفر اے سکندر — جو مردِ شکلِ ہستی نابود جانتے ہیں

جس خشت کو اٹھا کر دیکھیں وہ چشم دل سے
صورت کو اپنی اُس میں موجود جانتے ہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل سے ہے
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جانتے ہیں

عجز و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم عبد سے جُدا کب معبود جانتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے؟ کہ بیدؔ آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

(۷)

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اِس چمن سے صبا! چشم تر گئی

کیجیو اثر قبول۔ کہ تجھ تک ہماری آہ
سینہ سے ارمغاں لیے داغِ جگر گئی

دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں
زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی

خانہ خراب دل تو ہے لیکن میں کیا کہوں
جیسی بلائے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی

مت پوچھ یہ۔ کہ رات کٹی کیونکہ مجھ بغیر
اِس گفتگو سے فائدہ پیارے! گذر گئی

ظالم کروڑ گل کا گریباں ہوا ہے چاک
اِک عندلیب گر اجل اپنی سے مر گئی

پروانہ کون سا نہ جلا شام کو۔ کہ شمع
رونق ہوئی نہ بزم سے وقت سحر گئی

(۸)

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور۔ مرا عجز۔ تا کجا۔ ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

زبان شکوہ سوا اب زمانہ میں ہیہات!
کوئی کسی سے بہم دیگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم خارِ دشت پہ مجنوں
کہ اِس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ دہلی کے ارباب طریقت وارشاد سے تھے۔ ان کا دیوان ریختہ نہایت مختصر ہے غزلیات تمامتر عارفانہ۔ خوبی زبان و سادگی بیان کے لحاظ سے مقبول خاص وعام میر و میرزا کے ہمعصر تھے۔ ۱۱۹۹ھ ہجری میں بعمر ۶۸ سال رحلت فرمائی۔

(۱)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا / حقا! کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اُس مسندِ عزت پہ۔ کہ تو جلوہ نما ہے / کیا تاب؟ گذر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن / آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے / اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے درد! کھلی تھی / کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۲)

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما / اِس طرف کو کبھو گذر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم / نہ کیا تو نے رحم پر نہ کیا

آپ سے ہم گذر گئے کب کے / کیا ہے! ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آہ! / خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد / بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

لیکر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے / گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری اِدھر / یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس۔ نہ ارادہ کلاہ کا

سو بار دیکھیں ہیں نے تری بیوفائیاں
تس پہ بھی نت غرور رہے دل میں نباہ کا

اے درد! چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذبِ شوق
کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

(۴)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے۔ جو کچھ آرزو کریں

تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں۔ تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال! جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منھ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات۔ نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوسِ رنگ و بو کریں

(۵)

یاں عیش کے پردے میں چھپی دل شکنی ہے
ہر بزمِ طرب جوں مژہ برہم زدنی ہے

آگے جو بلا آئی تھی، سو دل پہ ٹلی تھی
اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

اے درد! بتا کس سے کہوں رازِ محبت
عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(۶)

دیکھیے جس کو یاں سو اوسی کچھ دماغ ہے
کر یک شب چراغ بھی گو ہر شب چراغ ہے

غیر سے کیا معاملہ؟ آپ ہیں اپنے دام میں
قید خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے

حال مرا نہ پوچھیے۔ میں جو کہوں سو کیا کہوں
دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ سو باغ داغ ہے

سنتے ہیں یوں کہ آہ تو ہم ہی میں تھا چھپا کہیں
اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے

غفلتِ دل ہوئی مگر پنبۂ گوشِ خلق درد!
بلبلِ داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

قصائد

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

تختِ کاغذ پہ ہوا صدرنشیں شاہِ قلم — دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکلِ علم

ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات — یہی لشکر ہے یہی فوج یہی خیل و خدم

ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم — وزرا مرتبہ و دبدبہ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو معانی ، تو معانی ہیں لطیف — ہیں وہی گنج و خزائن ۔ وہی دینار و درم

اہلِ دفتر نے جو کی کھول کے بستوں کو نشست — گردنِ منشیِ گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں — شقّے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم

وقتِ دربار ہوا - جمع ہوئے مجرائی — عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم

سامنے آنے لگے خیر طلب بہرِ سلام — ہر دہا تھا جو ادب کا - وہ کھڑا رہا پیہم

روبروئے خسروِ جم جاہ فلک فر کے نگاہ — تا ابد سلطنتِ پشت و پناہِ عالم

ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل — مسندِ حکم ہوئی مطلعِ انوارِ قدیم

روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ — حکمت الدولہ - جو تھا منشیِ یاقوت رقم

عرضیاں گزریں خلائق کے برآئے مطلب — لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابوابِ کرم

بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی — نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اس دم

کہ ملازم ہیں جو سرکار کے یہ دو آتش دم — درِ دولت پہ ہے ہنگامہ - لڑتے ہیں باہم

بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی — کہ بہم گتھ گئے ہیں صورتِ خطِ توام

حکمِ عالی یہ ہوا۔ جلد کرو حاضرِ بزم
دیکھیں کیا کہتے ہیں؟ خود دونوں میں ہم ہوں حکم

حاضرِ بزم ہوئے وہ۔ تو ہوا یہ ایما
کیوں لڑے؟ کیا سببِ جنگ ہے آگاہ ہوں ہم

عرض دانش نے یہ کی۔ روزِ ابد تک قائم
یہ حکومت۔ یہ ایالت۔ یہ شہامت یہ حشم

بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں
حکمرانانِ زمانہ روسائے عالم

ایک حاکم ہے۔ فلک جاہ۔ خرمند۔ ذکی
صاحبِ علم و ہنر۔ معدنِ اخلاق و کرم

نام ہے کلب علی خاں بہادر جم جاہ
جس کے خُدّام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم

علم میں۔ حلم میں۔ جود و کرم و ہمت میں
ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم!

جس میں جو بات ہو۔ کیونکر اُسے کوئی نہ کہے
پیشِ انصاف گزیں حق کا چھپانا ہے ستم

میرے کہنے کو ذرا وہم نے پایا ورنہ کیا
بلکہ مارا رہِ انکار میں منکر نے قدم

کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن
کارخانہ ہے خدا کا۔ نہیں خالی عالم

کیسے کیسے نہیں گذرے ہیں جہاں میں نامی؟
خواجگانِ عربستان و صنادیدِ عجم

سارے عالم میں ہے سحباں کی فصاحت مشہور
سارے آفاق میں کسریٰ کی عدالت ہے علم

کس کو معلوم فلاطوں کی نہیں ہے حکمت؟
حکمِ نادر ہے عیاں۔ جلوہ نما عشرتِ جم

چار سو ہمتِ حاتم کا ہے آوازہ بلند
شش جہت پر ہے عیاں سب سے جری تھا رستم

تو جو کہتا ہے۔ کہ ان سب سے ہے بڑھ کر کوئی
زعمِ باطل ہے فقط مانتے ہیں کب اسے ہم

میں یہ کہتا ہوں میں دعوی پہ ہوں اپنے صادق
ہیں دلائل۔ جو ہوں گوشِ شنوا گوشِ اصم

کچھ یہ سنتا نہیں انکار یہ باندھی ہے کمر
گفتگو سے طرفین آپ تنیں ہو کے بہم

ہو گیا حکم۔ کہ ہاں محکمۂ بحث ہو گرم
ایک ایک بات کا ہو فیصلہ لا ہو کہ نعم

(۳)

فصلِ گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں
بڑھ گیا رشکِ رضواں سمجھے ہیں اُن کو نقلِ باغ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے
جیسے مجمع عید کا ہوں حسینانِ جہاں

خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہی ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں

قُم باذنِ اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں

جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں
رقص میں سارے ہیں ہر طرف طاؤس ہو کر شادماں

لالہ کہتا ہے کماں ہوتی ہیں یہ آکر دیکھ لیں
صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں

جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں

لالۂ احمر نے یاقوت کی ڈبیا کی درست
نرگسِ شہلا نے رکھی مے فروشی کی دکاں

داربستِ تاک میں خوشے نظر آنے لگے
جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں

سیمِ غنچہ کیوں نہ سمجھے ہو زرِ گل بے شمار
رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں

ہر روش پہ بچھی ہے بزازِ چمن کر مخملی
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں

فیضِ شبنم نے دیے اشجار کو آبی لباس
بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں

نو عروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق
بھیجے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں

یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسینِ دامن کشاں

ہے مبارک فال۔ کوئی ہونے والی ہے خوشی
ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں

جان پھولوں میں پڑی۔ زندہ ہوئی خاکِ چمن
ہے دمِ جاں بخشِ عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

قمریوں کا قول ہے سچ ہیں طیورِ باغِ خلد
سرو کہتا ہے۔ کہیں میں طوبیِٰ باغِ جناں

صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ
مرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر یہاں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں
ہے محیطِ مشرق و مغرب بہ رنگِ کہکشاں

پائے گر سورج کبھی کے سایہ میں تھوڑی سی جگہ
بھول جائے پھر جنبش مثلِ قطبِ آسماں

چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب ہے فرشِ فضائے بوستاں

سیر کو جو آئے۔ اس کا نافۂ آہو ہو مشام
گیسوئے مشکین سنبل لپکہ ہے عنبر فشاں

دیدۂ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے
خواب میں کرتا ہے سبزہ سیرِ گلزارِ جناں

ہے تبسم غنچۂ گل کا کہ تیغ آبدار
نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبھوتے ہیں سناں

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلما ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام
مگر اس میں شک نہیں جلسہ ہے آپکا بے ہنگام

کسی طرف سے بھی آوازِ خوش نہیں آتی
کچھ ایسا بگڑا ہے نظمِ لیالی و ایّام

وہ بمبئی۔ کہ جو تھا مرکزِ تجارتِ ہند
وبا نے کر دیا گویا کہ اُس کا کام تمام

مقام۔ رت جگے رہتے تھے جن میں ساری رات
وہ کر رہے ہیں بھائیں بھائیں اوّل شام

حکایتیں جو مصائب کی اُن سے سنتے ہیں
تو دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں ہم کلیجہ تھام

خدا ہی جانے ہوئیں کتنی عورتیں بیوہ
خدا ہی جانے ہوئے بچّے کس قدر ایتام

جلا وطن ہوئے کتنے کہ جو نہ ٹھہر سکے
کوئی سلون کو بھاگا۔ کوئی گیا آسام

مگر پناہ نہیں آہوئے حرم کو بھی
کہیں جہان میں جس دم قضا بچھائے دام

مزاق کرتے ہیں لیکن نہ یوں مفاجاۃً
تپ آئی صبح کو۔ دن چڑھتے ہو گیا سرسام

ہوئی دوپہر۔ تو دنیا سے ہو گئے رخصت
کہ تپ کے ساتھ ہی آیا تھا مرگ کا پیغام

ہزاروں آدمی گر جاں بحق ہوئے۔ تو ہوئے
یہ کیا غضب ہے! ہوئی طب رہی سہی بدنام

علاج جتنے کیے۔ سب کے سب گئے بے سود
بتائیں جتنی تدابیر۔ سب رہیں ناکام

بس اب کھُلا۔ کہ طبابت کی اتنی ہستی ہے
کہ جھٹ سے لکھدیا خیسا ندہ از برائے زکام

سکنجبین کو فرمایا قاطعِ صفرا
مریض ہیں کو بتلایا روغنِ بادام

بنی جب آن کے جانوں پہ اور رہے عاجز
تو ایسی طب کو سلام اور سلام اور سلام

دوا کا حیلہ ہے۔ گر وقت ابھی نہیں آیا
تو ہوتے دیکھا ہے خشکی سے خاک کی آرام

اور آن پہونچا ہے وعدہ۔ تو بس سمجھ رکھو
دُعا۔ دوا کوئی تدبیر بھی نہ آئے کام

ادھر وبا نہیں۔ یہ قحط اور گرانی سے
مچا ہوا ہے ہر اک گھر میں رات دن کہرام

غلط۔ کہ عید ہوئی۔ کوئی ہم کو سمجھا دے
یہ فاقے کیسے؟ اگر ہو چکا ہے ماہِ صیام

ہمیں تو بے زری و مفلسی نے مار دیا
وگرنہ کیا تھا۔ جو ہوتے گرہ میں اپنی دام

وبا و قحط سے باقی تھا کیا اجڑنے میں؟
مگر بچے کو نگہبانِ خلق سے تھے تھکام

کجا فراغ! خوشی کیسی! کس کا اطمینان!
ان آفتوں کے سبب ہو رہی ہے راحت حرام

پھری ہوئی ہے خدا کی نظر کچھ ان روزوں
کہ ہم نے توڑے ہیں اس کے ضوابط و احکام

بساط یہ ہے۔ اور اس پہ گناہ کی جرأت
نمود یہ ہے۔ اور اس پہ قصور کا اقدام

سوائے توبہ نہیں کچھ علاجِ قہرِ خدا
طبیب ہو کہ طبابت۔ کسی پہ کیا الزام!

وہ چاہے مار دے ہم سب کو بے وبا بے قحط
بقا تجھی کو ہے۔ اے ذوالجلال والاکرام!

گناہگار ہیں پر معترف قصور کے ہیں
وسیع ہے تری رحمت۔ کریم ہے تیرا عام

جئیں۔ تو خوش جئیں۔ اور امن و عافیت سے جئیں
جب آئے موت۔ تو سب کا بخیر ہو انجام

حکیم مومن خاں۔ مومن

کوئی اس دور میں سے جیے کیونکر
ملک الموت ہے ہر ایک بشر

دادخواہوں کے شور سے دیکھو
جو نک پڑتا ہے فتنۂ محشر

آئینہ نے بھی اس زمانہ میں — تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر

ہے پئے اشتیاقِ ویرانی — شاہِ فرہاد و بے ستوں کشور

نہ امیروں کو پاسِ بندیِ عدل — نہ رعایا مطیع و فرماں بر

اُس کو سو رستمِ زماں کا خطاب — جو کرے قتل خُرد سالہ پسر

چمن آرا کو رسمِ پیرائش — اِک بہانہ ہے بہرِ قطعِ شجر

پاکے الزام دستِ خالی سے — فلسفی پیٹتا ہے اپنا سر

آب و ناں کے لئے گرو رکھیں — رستمانِ زمانہ تیغ و سپر

شعرا کو یہ آرزوے شعیر — خوانِ عیسیٰ ہے نیم خوردۂ خر

کام آئے نہ نغمۂ شیریں — طوطیوں کو ہے حسرتِ شکّر

سرورانِ سپہر مرتبہ ہیں — بسکہ جاہل نواز دوں پرور

واعظوں کی زباں پہ آتا ہے — بر ملا شکوۂ قضا و قدر

کہے مفتی سوال کو واجب — کسب مفقود جو ہوئے یکسر

پھلے پھولے ہیں بے خرد۔ کیا دُور! — بیدِ مجنوں بھی گر لے آئے ثمر

سختی و کاہلی کی دولت سے — دامنِ کوہ میں ہیں لعل و گہر

باندھتے ہیں سخن سرا موزوں — کس طرح ہو نصیبِ سرو کو بر

قدر دانی کا نام ہی نہ رہا — چند ناداں ہوئے ہیں نام آور

ایک امیرِ سخن شناس نہیں — لاکھ ہیں شاعرِ ثنا گستر

اے لبِ یاوہ گوے ہرزہ درائے — بس کہاں تک یہ ناستودہ سمر

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام — ایسی باتوں سے خامشی بہتر

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا!
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ!
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ماہتاب بن۔ میں کون!
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جبکہ بخشے گا تجلو فرِّ فروغ — کیا نہ دے گا تجھے مۓ گلفام
جب کہ جو دہ منازلِ فلکی — کرچکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا۔ تو مجھ سے سن — نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شیخ ابراہیم ذوق

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے — تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت
جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام — عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیہ — پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیت
چار و ناچار جو ترغیب سے یاروں کے کبھی — درس و تدریس پہ آجاتی تھی مجکو رغبت
کبھی تہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صَرف — کبھی تھی نحو میں ہر نحو سے مجھے محو یت
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں — کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہنِ رسا — کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی تھی عرصۂ تدویرِ فلک کی مجھے سیر — کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وسعت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش — کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول ۔۔۔ کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت

کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریحِ علاج ۔۔۔ کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیحِ لغت

کبھی میں نون سے بینندۂ بیمار و صحیح ۔۔۔ کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت

گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے ۔۔۔ گہ جمادات کی معلوم تھی مجھے خاصیت

جوں مُہندس کبھی مالوف پہ شکل و مقدار ۔۔۔ جوں مُحاسب کبھی مصروف پہ ضرب و قسمت

کبھی کرتا تھا قِران مہ و زہرہ پہ نظر ۔۔۔ کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت

کبھی تھا علمِ قیافہ میں یہ ادراک مجھے ۔۔۔ ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت

کبھی میں شاعرِ عرّا ادب دانِ بلیغ ۔۔۔ نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت

کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ ۔۔۔ طبعِ موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کبھی میشِ نظر انجیل و زبور و توریت ۔۔۔ کبھی مصحف میں نظر میری سراسر آیت

کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پُران ۔۔۔ کروں اک بات سے پنڈت کی تھا میں کم مثلت

آخرش دیکھا ۔ تو اَنعلم حجابُ الاکبرُ ۔۔۔ عاقبت پایا ۔ تو ہاں ابلہ کو اہلِ جنت

فائدہ کیا؟ کہ جو ہر علم کی جانی تعریف ۔۔۔ فائدہ کیا! جو ہوئی آگہی ہر ملّت

بے مُقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر ۔۔۔ دُور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کلفت

(۳)

واہ واہ! کیا معتدل ہے بلغ عالم کی ہوا! ۔۔۔ مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

جبرئی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار! ۔۔۔ بنگیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر ۔۔۔ شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق ۔۔۔ لالہ ہے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
بانی یہ اصلاح صفرے نے کہ دُنیا میں کہیں
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
تا مکو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دورہ
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی تھی صدف
آگیا اصلاح پہ ایسا زمانہ کا مزاج
نسخہ پہ لکھنے نہیں پاتا ہُوَ الشافی طبیب
فرق جاتا یاں تک اعضاے بدن سے درد کا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت پیچ و تاب
صبحِ صادق کے ہے گو سر پہ سپیدی آگئی
بھوک کی شدت سے اس کو اک نفس فرصت نہ ہو
رات بھر نشو و نما کیا انجم کے تارے چرخ پیر
پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
پوست پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
ہضم کا مل اس قدر معدہ نے پہونچا یا بہم

بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ حنا
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
بنگئی تریاک افیوں۔ زہر میٹھا ہو گیا
نیش کی جا نوشِ حنظل دیوے شربت کا مزا
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجاے آبلا
چاہیے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
کہتا ہے بیمار بس کر مجکو ہے بالکل شفا
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا
کیسے دو ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا
پھر جو دیکھا صبح کو۔ اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
جوں حباب اسکے نہیں مطلق شکم میں امتلا
جیسے الکیموس ہے جو حلق سے اترا سی غذا

ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینک دیگی توڑ کر گنڈا اگلے سے فاختا

(۳۳)

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاط و طرب سے لبالب آج
اک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں

دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں
گر ہو تمام چشمِ تماشا گر آسماں

اِترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں

افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب۔ اگر
مثلِ حباب جامے سے ہو باہر آسماں

شادی کی اس کی دھوم ہے آج آسماں تک
تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں

فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کو ہے جس کے جھکاتا سر آسماں

ہے اس کی بارگاہ میں مانندِ چوبدار
حاضر عصائے کاہکشاں لے کر آسماں

اس بیاہ کی تو دید سے ہے اس قدر بعید
ہے پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا! کہ ٹھہر سکے دم بھر آسماں

فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کی ہو کم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

خواجہ الطاف حسین حالی

ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سراسر
ہے جوبلی ہے جوبلی اک اک کی زباں پر

یہ عہد کہ گذرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر

وہ دور تعصب تھا۔ یہ ہے دورۂ اخلاق
وہ جنگ کا موجد تھا۔ یہ ہے صلح کا رہبر

اس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے
تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر

اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیٔ دختر

جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی
دی زندگی اک اور انھیں علم پڑھا کر

اس عہد نے کی آکے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انساں سے کمتر

دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسمِ ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر

نابود کیا اس نے زمانہ سے ٹھگی کو
اک قہر تھا اس عہد کا جو نوعِ بشر پر

اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ
مظلوم نہ اب بیل۔ نہ گھوڑا ہے نہ خچر

اے نازشِ برطانیہ۔ اے فخرِ پرنزک
اے ہند کے گلّہ کی شباں۔ ہند کی قیصر

سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گذرا
محمود نہ تیمور ہنیبل نہ سکندر

تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر

بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو
معمور مساجد ہیں۔ تو آباد ہیں مندر

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

گو منّتِ قیصر سے ہے ہر قوم گرانبار
احساں مگر اسلام پہ ہیں اس کے گراں تر

اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری
ہر قوم کے ہیں پیر و جواں متفق اس پر

امّید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
راحت کی کسی سایہ میں جز سایۂ قیصر

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لئے اور نہ دفتر

ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
آزادی و انصاف حکومت کے ہیں مظہر

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

قطعات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱) بے تمیزی ابنائے زماں

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا — ہے وجود اسے متبذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس پرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ — تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا — امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا — گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز — ہیں مبصر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں — تجھ سے لے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

(۲) جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا برا نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا — جب کہتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر — ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا — یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت — جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو انگر — پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت نہ ہے اقبال — گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی | پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

(۳) بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو! | ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز | جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت | تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو۔ تو اُٹھو نہ جب تک | کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر مل پڑے چوسر اور گنجفہ پر | تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا۔ تو جانو | کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پہ | تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا۔ تو سمجھو | کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ۔ تو پی جاؤ اتنی | رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بےحد۔ جو پینا تو اَت گت | غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر | اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادتِ اورنگ | فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام | تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریلؑ
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیمؑ | تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیلؑ
بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ | بکرم داغِ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثَور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجکو اماں
چرخ کجباز نے چاہا کہ کرے مجکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدہ کو سو بھی باشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر!
قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج۔ اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھکو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

خسروا اس کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عشرت تری دے ہے چمن کو جا کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پارنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج
تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر
آگے ہمت کے تری گوہرِ شہوار کے گنج

حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش
دستِ حاتم میں بجا ہے۔ کہ جو دیں تیغ و ترنج

ششِ ہمت پہ ہے جو غالب ترا سرپنجۂ امن
فتنے کو اٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج

نہ بجھے آب سے آتش۔ نہ خس آتش سے جلے
ایک سے ایک موافق۔ کہ مرنجان و مرنج

تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم
صفحۂ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج

لایا ہے معنیِ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ
ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج

خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ
رنگِ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج

بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

مُسَدّسات

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر حسن دہلوی کے نامور پوتے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی اِن کی چار دانگ ہند میں مشہور و مسلم تھی۔ فصاحت بیان اور لطافت محاورہ میں ان کا کلام اس پایۂ بلند پر پہونچا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ؎

صفتِ صبح

طے کرچکا جو منزلِ شب۔ کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمر و شاخِ کہکشاں
دِکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمُردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا۔ وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا۔ وہ فضا۔ وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو۔ ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت۔ وہ صحرا۔ وہ سبزہ زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

غریب الوطنی

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں

سو شغل ہوں پر دھیاں لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد

جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر
منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر

جب ہو سفر خوف و پریشانیٔ خاطر
شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہونچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے

ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے۔ تو اٹھاتا نہیں کوئی

صفت تیغ

تھا صورتِ آئینہ تمام اس کا بدن صاف
چلتی تھی جو سن سن - یہ نکلتا تھا سخن صاف
خوں پیتی تھی پر دیکھو تو منھ صاف دہن صاف
ہوں میں تو وہ جاروب - کہ کردیتی ہوں بن صاف
نا اہل ہیں - نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا
میں برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

مغفر سے جھلم کاٹ کے گردن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا کہ بس تن میں در آئی
گردن سے سرکنا تھا کہ جوشن میں در آئی
تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی
بچتا کوئی کیا تیغِ قضا رنگ کے نیچے
اک برقِ غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

تیری کبھی - گہ خوں میں نہا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ - موج میں جا کر نکل آئی
ٹھہری کبھی - غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی
کیا ڈر اُسے طوفاں کا - جو چالاک ہوا ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو - تو پیراک ہوا ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر - نہ افعی میں یہ سم تھا
تیزی پہ جسے ناز تھا - سر اُس کا قلم تھا
یہ فتح کی جویا تھی - قد اس واسطے خم تھا
بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

(۲)

بجلی سی جو گر کر صفِ کفار سے نکلی
آوازِ بزن تیغ کی جھنکار سے نکلی

گہ ڈھال میں ڈوبی۔ کبھی تلوار سے نکلی
درآئی جو پیکاں میں۔ تو سوفار سے نکلی
تھے بند خطاکاروں پہ دَر امن و اماں کے
چلّے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کماں کے

افلاک پہ چمکی کبھی۔ سر پر کبھی آئی
کوندی کبھی جوشن پہ۔ سپر پر کبھی آئی
گھس پڑ گئی سینہ پہ۔ جگر پر کبھی آئی
تڑپی کبھی پہلو پہ۔ کمر پر کبھی آئی
طے کرکے پھری۔ کونسا قصّہ تھا فرس کا!
باقی تھا جو کچھ کاٹ۔ وہ حصّہ تھا فرس کا

پے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو۔ لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن۔ رنگ زمرّد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو! پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سرچشمے۔ تو موج اُس کی روانی کو نہ پہونچے
قلزم کا بھی دھارا ہو۔ تو پانی کو نہ پہونچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہونچے
خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہونچے
دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بُری تھی
برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی چھُری تھی

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی
دم خم بھی۔ لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی
امرت بھی۔ ہلاہل بھی۔ مسیحا بھی قضا بھی
کیا صاحبِ جوہر تھی عجب ظرف تھا اُس کا
موقع تھا جہاں جس کا۔ وہیں صرف تھا اُس کا

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اس کا … تھا لشکرِ باغی میں ازل سے عمل اس کا
ڈر جاتی تھی منھ دیکھ کے بزدل اجل اس کا … تھا قلعۂ چار آئنہ گویا محل اس کا

اس در سے گئی۔ کھول کے وہ در نکل آئی
گہ صدر میں بیٹھی۔ کبھی باہر نکل آئی

تیزوں پہ گئی برچھیوں والوں کی طرف سے … جا پہونچی کمانداروں پہ بھالوں کی طرف سے
پھر آئی سواروں کے رسالوں کی طرف سے … منھ تیغوں کی جانب کیا ڈھالوں کی طرف سے

بس ہو گیا دفتر نظری نام و نسب کا
لاکھوں سے تھے تو کیا! دیکھ لیا جائزہ سب کا

پہونچی جو سپر تک۔ تو کلائی کو نہ چھوڑا … ہر لہر میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا … تیزی کو رگ کھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

چار آئنہ والوں کو نہ تھا جنگ کا یارا … جو رنگ تھے سینے۔ تو کلیجہ تھا دو پارا
سکتے تھے زرہ پوش نہیں تاب مدارا … بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا

جوشن کو سمجھتا تھا کہ حفاظت کا محل ہے
اس کی نہ خبر تھی۔ کہ یہی دامِ اجل ہے

بدکیش سب لڑائی کا چلن بھول گئے تھے … ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
سب حیلہ گری عہد شکن بھول گئے تھے … بیہوشی میں ترکش کے دہن بھول گئے تھے

معلوم نہ تھا جسم میں جان ہے کہ نہیں ہے … چلاتے تھے قبضہ میں کماں ہے کہ نہیں ہے

صفت اسپ

لکھتا ہے ادہم قلم اب سرعتِ عقاب　　نعل اُس کے ماہِ نو ہیں۔ تو سم رشکِ آفتاب
پستی میں سیل ہے۔ تو بلندی میں ہے سحاب　　سرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب
اُڑنے میں اُس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی موج ہے

نازک مزاج۔ نسترن اندام۔ تیز رو　　گردوں مسیر۔ بادیہ پیما و برق دو
اُس کا نہ اک قدم۔ نہ زغندیں ہرن کی　　دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے۔ نہ جو
رفتار میں ہوا تھا۔ اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی۔ نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند۔ بو سے سبکرو۔ ہوا سے تیز　　چالاک فہم و فکر سے۔ ذہنِ رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز　　جانے میں اُڑکے ہدہدِ شہرِ سبا سے تیز
ذی جاہ تھا۔ سعید تھا۔ فیروز بخت تھا
رہوار کیا! ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا　　چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑکے۔ برچھیوں میں بے خطر گیا　　برہم کیا صفوں کو۔ پروں سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی۔ کہ سروہی کا وار تھا

(۲)

کوتاہ و گرد و صاف۔ کنوتی کمر کفل　　کیا خوش نما کشادگی سینہ و بغل!

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
پھرتا تھا اِس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

رہ اک لب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لیے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ۔ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی۔ کہ مُڑ گیا

آہو کی جست۔ شیر کی آمد۔ پری کی چال
کبکِ دری خجل۔ دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سُبک روی میں قدم کے تلے نہال
اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال

جو آ گیا قدم کے تلے۔ گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا۔ کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق۔ تو ابرِ گہربار بن گیا
گہ قطب۔ گاہ گنبدِ دوّار بن گیا
نقطہ کبھی بنا۔ کبھی پرکار بن گیا

حیران تھے اُس کی گشت پہ لوگ اِس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

ایک مثمن

از مؤلف

کیفیتِ قلعۂ اکبر آباد

یا رب! یہ کسی مشعلِ کُشتہ کا دُھواں ہے
یا برہمیِ بزم کی فریاد و فغاں ہے
ہاں! دورِ گذشتہ کی نجابت کا نشاں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
یا بانیِ عمارت کا جلال اِس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیِ اکبر

باہر سے نظر ڈالیے اِس قلعہ پہ یک چند
گویا کہ ہے اِک سورما مضبوط تنومند
کیا پارۂ سنگین کا پہنا ہے قزآگند!
برپا ہے لبِ آب جمن صورتِ الوند
یا ہند کا رجپوت ہے۔ یا ترکِ سمرقند
ریتی کا قزآگند پہ باندھا ہے کمر بند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لئے برج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں
کی ہے شعرا نے صفتِ طاقِ فریدوں
گو ہمسرِ کیواں ہے نہ ہم پلۂ گردوں
پُر شوکت و ذی شان ہے اُس کا رُخِ بیروں
معلوم نہیں اِس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں

پیلانِ گراں سلسلہ باہودجِ زرّیں
اِس در سے گذرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا — یا طنطنۂ دورِ جہانگیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا — یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصّہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا — دنیا سے ہوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اِسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشنِ ملوکانہ اِسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّٰے کہ جہاں عام تھا دربار — آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
وہ سقفِ زر اندود ہے مانندِ چمن زار — وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
اب بانگِ نقیب اُس میں نہ چاؤش کی للکار — سرہنگ کمربستہ۔ نہ وہ مجمعِ حُضّار

کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیت کو مرا وقر تھا منظور — تا فقد تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہانِ معاصر کا معیّن تھا یہ دستور — کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور — آوازہ مری شان کا پہونچا تھا بہت دور

اکنافِ جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں؟ — وہ شاہ۔ وہ نوئین۔ وہ خاقان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور۔ وہ دیوان کہاں ہیں؟ — خدّامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟

وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سُنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہِ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت

بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی عبارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت

جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت
سیّاحِ کیا کرتے ہیں اب اُس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دَرُوں کا
"تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا"

اورنگِ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام
بوسے جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام

اشعار میں ثبت اس پہ جہانگیر کا ہے نام
شاعر کا قلم اُس کی بقا لکھتا ہے مادام

پر صاف نظر آتا ہے کچھ اَور ہی انجام
سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام

فرسودگی دہر نے شق اب تو کیا ہے
آیندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لیے خاموش ہے او تختِ جگر ریش؟
کس غم میں سیہ پوش ہے کیا سوگ ہے درپیش؟

کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش؟
جوگی ہے ترا بھیس کہ صوفی ہے ترا کیش؟

بولا کہ زمانہ نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گذری ہیں یہاں تین کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظّم کے قدم میں نے چھوئے تھے

رنگیں محل اور برجِ مثمّن کا وہ انداز
صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز

یاں مطربِ خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز
اب کون ہے؟ تبلائے جو کیفیتِ آغاز
گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
زنہار! کوئی جاہ وحشم پر نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منوّر
اب اُن کا مقابر میں تہِ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب
وہ جامِ بلوریں ہیں۔ نہ وہ گوہرِ نایاب
ہنگامہ جو گذرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب
فوّارے شکستہ ہیں۔ تو سب حوض ہیں بے آب
وہ چلمنِ زرتار۔ نہ وہ بستر کمخواب
یہ معرضِ خُدّام تھا۔ وہ موقفِ حجّاب

وہ بزم نہ وہ دَور۔ نہ وہ جام۔ نہ ساقی
ہاں! طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گل
کچھ خیریِ فرغانہ تھے۔ کچھ لالۂ کابل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامّل
سو دودۂ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کل
پھر مولسری ہند کی اُن میں گئی مل جل
تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمّل

سیّاحِ جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالاتِ مرکّب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
زنجیرِ عدالت بھی ہوئی تھی یہیں ایجاد
وہ نورجہاں اور جہانگیر کی اُفتاد
ہوتی تھی تو لادان میں کیا کیا دہش و داد
جو سمعِ شہنشاہ میں پہونچاتی تھی فریاد
اِس کلخِ ہمایوں کو یہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اُس کی مورّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھیے وہ مسجد و حمام زنانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ! کہاں ہے وہ زمانہ
وہ نہر۔ وہ حوض۔ اور وہ پانی کا خزانہ
ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں **نور جہاں** ہے

وہ قصر جہاں جودھپوری رہتی تھی بائی
دیکھا اسے جا کر۔ تو بڑی گت نظر آئی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دُہائی
تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی
ممکن نہیں طوفانِ حوادث سے رہائی

جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گل و لالہ
اب نسلِ ابابیل میں ہے اس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا۔ کہ ہے اس بزم کی دُلہن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن
کافور کا تودہ ہے۔ کہ الماس کا معدن
خوبی میں یگانہ ہے۔ و لے سادہ و پُر فن
موتی سے ہیں دالان۔ تو ہے دودھ سا آنگن
یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن

بلّور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوّتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اِک سحر کیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھّر کو سیا ہے
نے شمع۔ نہ فانوس۔ نہ بتّی۔ نہ دیا ہے
سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
ہاں چشمۂ خورشید سے آب اُس نے پیا ہے

چلیے جو یہاں سے تو نظر آتی ہے فی الفور
نظارہ کی دو مجکو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — اِس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اُس نے کہانی — کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
"اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح نہ تہلیل۔ نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے"

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و اُمرا کا — مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا — ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اِک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا — جو کچھ تھا گذر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکین

وہ دَور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی — جو واقعہ حسّی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان۔ ہر اک منزلِ عالی — عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند۔ اہالی۔ نہ موالی — جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی
یہ جملہ محلات۔ جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار — اور لُوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلاکار
تب ایک جو تھا لشکرِ انگلش کا سپہدار — افواجِ مخالف سے ہوا برسرِ پیکار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان۔ یہ دیوار — کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار
ہے گردشِ ایّام کے حملوں کی کسے تاب

پھر قلعۂ اکبری ہی میں کیا تھا پر مُسرخاب!

آخر کو مخالف کی شکستہ ہوئی قوت　　　اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر عَلَمِ امن و حفاظت　　　آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمّت
یہ بات نہ ہوتی - تو پہونچتی وہی نوبت　　　دیوار گری آج - تو کل بیٹھ گئی چھت

ہنگامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور　　　اکبر کی بنا اس سے بھی پایندہ ہے اک اَور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جَور　　　ہر چند گذر جائیں بہت قرن بہت دَور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برجِ حمل و ثور　　　اس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور

انجینیروں کی بھی مرمّت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے فقط ناموری ہے

اے اکبرِ ذیجاہ! تری عزّت و تمکیں　　　محتاج مرمّت ہے - نہ مستلزمِ تزئیں
کندہ ہیں دلوں میں تری اُلفت کے فرامیں　　　ہے تیری محبّت کی بِنا اک وثرِ روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں　　　زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تری صحبت نے بھلایا　　　اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمّت نے بھلایا　　　کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا　　　پچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا

رُباعیات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع ۔ جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

(۲)

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اُس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

(۳)

ہیں یار رفیق ۔ پر مُصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز ۔ لیک ذلت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خو و جبلّت میں نہیں

(۴)

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

از مؤلف

(۱)

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال
کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی
ہاں! راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

	(۲)	
گر نیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے		یا بدمنشی سے کچھ برائی کی ہے
اپنے ہی لیے ہے سب نہ اوروں کے لیے		اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے
	(۳)	
دین اور دنیا کا تفرقہ ہے مہمل		نیت ہی پہ موقوف ہے تنقیحِ عمل
دنیاداری بھی عین دینداری ہے		ہر کو ہو گر رضائے حق عزّ و جل
	(۴)	
دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز		ڈھونڈھا تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا پانا ہے سب فضولی اپنی		یہ خبط نہ ہو سمجھے خدایا ہرگز

امیر مینائی

	(۱)	
گھر چھوڑنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے		روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر		یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے
	(۲)	
بالفرض حیاتِ جاودانی تم ہو		بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملے تو خاک سمجھیں تم کو		ہیں نام نہ پیاس کا ۔ جو پانی تم ہو

مرزا غالب

	(۱)	
حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے		تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر - کہ افزائشِ اعداد کرے

(۲۰)

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے!
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

میرانیس

(۱)

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے
ہر گل کو گلہ کم اتفاقی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
"رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے"

(۲)

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب
غافل! اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

(۳)

ہشیار! کہ وقت ساز و برگ آیا ہے
ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا
"چلیے - اب چوبدارِ مرگ آیا ہے"

(۴)

گلشن میں پھروں - کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں - کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

(۵)

انساں ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں
سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں

اندیشۂ آشیان و خوفِ صیاد
مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

(۶)

ہر طرح سے یہ سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر تقی

(۱)

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

(۲)

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیے
مائل دلِ تنگ کو قضا پر رکھیے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر
سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھیے

(۳)

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

تمام شد حصۂ نظم